غالب

(مضامین مسعود حسن رضوی ادیب)

ترتیب و تہذیب:

ڈاکٹر طاہر تونسوی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

غالب

(مضامین مسعود حسن رضوی ادیب)

غالب

(مضامین مسعود حسن رضوی ادیب)

ترتیب وتہذیب:

[redacted] طاہر تونسوی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

GHALIB

(Mazameen-o-Masood Hasan Rizvi Adeeb)

Edited BY :

Dr. TAHIR TAUNSVI

ISBN No. 81-8172-025-3

اشاعت : ۲۰۰۸ء

قیمت : [redacted]

مطبوعہ : اصیلا آفسٹ پریس، دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ،

ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲

www.ghalibinstitute.com – E-mail: ghalib@vsnl.net

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

اور

قائم نقوی

کے نام

آئینہ ترتیب

ضمیمہ

پیش لفظ

سید مسعود حسن رضوی کے بے شمار مقالات اور مضامین ایسے ہیں جنھیں موضوع وار یکجا نہیں کیا گیا۔ اِس حوالے سے کئی کُتب مرتب و مدون کی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین کو مَیں نے "لکھنویاتِ ادیب" کے نام سے مدون کیا اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے مغربی پاکستان اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۹ء میں اسے شائع بھی کیا اور یوں یہ مضامین محفوظ ہو گئے۔ "غالب ـــــ تب اور اَب" مضامینِ ادیب کی دوسری کڑی ہے اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اِس میں غالب سے متعلق مضامین اور تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ اِس کے ساتھ دو مضامین کا ضمیمہ بھی لگایا گیا ہے کہ ان کا تعلق بھی غالب سے ہے۔

مسعود حسن رضوی کی غالب فہمی کے بارے میں مَیں نے مقدمے میں اظہارِ خیال کر دیا ہے اور پھر مضامین کے مطالعے سے بھی مسعود حسن رضوی کے کام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بات اہم ہے کہ غالب کے سلسلے کے یہ مضامین کتابی شکل میں سامنے آکر محفوظ ہو جائیں گے اور اس کے لیے ملک مقبول صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ جنھوں نے انھیں کتابی صورت میں شائع کیا۔ مَیں نے اپنی اِس کاوش کو اپنے دوستوں ڈاکٹر محمد اجمل نیازی اور قائم نقوی کے نام معنون کیا ہے کہ یہ دونوں غالب کے بھی طرف دار ہیں اور طاہر کے بھی اور مجھے ان کی دوستی پر ناز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ غالب اور مسعود حسن رضوی دونوں پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب حوالے کا کام دے گی۔

طاہر تونسوی۔ ملتان ۳۰ نومبر ۹۰ء

مکتوبِ یگانہ بنام سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

۲۵ر دسمبر ۱۹۲۳ء !

مکرمی جناب مسعود صاحب سلامٌ علیکم۔ نوازش نامہ صادر ہوا خیر آپ نے "ترانہ" کی رسید تو بھیجی ورنہ یہ تو (گویا) ایسی قابلِ نفرت چیز ہے کہ بہتیرے اصحاب نے رسید تک بھیجنا خلافِ اخلاق سمجھا۔ مَیں پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ رسید بھیجنا تو کُجا بعض اصحاب اسے دیکھ کر جامہ سے باہر ہو جائیں تو کوئی عجب نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ آخر کی چند رُباعیاں (وہی جن میں غالب پر تمسخر کیا گیا ہے) شائع نہ کی جاتیں تو اچھا تھا۔ انھیں شائع کرکے گویا مَیں نے اپنے ہی خواہوں کا (ہی خواہ بقول آپ کے) دل دُکھایا ہے۔ خیر یوں ہی سہی۔ غلط بینی، غلط فہمی کے سبب کوئی آپ چڑ کا کھا جائے تو اور بات ہے ورنہ مجھے دل دُکھانے کی کیا ضرورت۔ البتہ آزمانا ہے کہ ہنر کو ہنر کی حیثیت سے جانچنے اور قدر کرنے کی صلاحیت مُلک میں کتنی ہے۔ آیا لوگ اپنے ہی ہم خیال و ہم مذہب کے ہنر کو دیکھ سکتے ہیں۔ یا غیروں کے بھی۔ میرا مذہب غالب پرستی نہیں ہے بلکہ خود پرستی یا حق پرستی۔

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

دوسری ضرورت ان ظریفانہ رُباعیوں کی یہ ہے کہ غالب پرستوں کی دیوانہ وار

عقیدت اور بھی ہوتی ذہنیت پر کچھ چوٹ تو پڑے۔ ذرا اپنے حواسوں میں تو آئیں۔ غالب کو ایک دیوتا یا آسمانی شخصیت کی طرح پیش کرکے دُنیا کی مہذب قوموں کو ہندوستانی دماغوں پر ہنسنے، قلاقنے کا جو موقع دیا جارہا ہے اس پر ذرا غور تو کریں۔ غالب کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال، دِقت پسند شاعر جو بسا اوقات اپنے اوٹ پٹانگ تخیلات کی بھول بھلیاں میں گُم ہو جایا کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ پرلے سرے کا بے سرا بھی ہے۔ پُرانا چور اور چور کے ساتھ گونگا بھی ہے۔ مضمون چُرانے کو چراتا ہے مگر ہضم نہیں کر سکتا۔ تصرف کی قدرت نہیں رکھتا چوری کُھل جاتی ہے۔ زبان ایسی گونگی کہ نفس مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کر سکتا۔ ٹھونس ٹھانس کے تُک بندی کر لیتا ہے۔ غالب کے ان شاعرانہ نقائص کی طرف گزشتہ بیس سال کی مدت میں بارہا اشارے کر چکا ہوں جو سمجھنے والوں کے لیے کافی تھے مگر اب کچھ ایسی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایک مستقل رسالہ مرتب کرکے غالب کی چوریوں اور نقالیوں کو اچھی طرح کھنگال ڈالوں مجھے کیا ضرورت تھی کہ غالب کے ان عیوب کی تشہیر کرتا مگر غالب پرستوں کی کورانہ عقیدت نے تمام شعرائے ماضی و حال کے حقوق چھین کر سب غالب کو دے دیتے ہیں۔ سب کے کارناموں کو فراموش کرکے غالب کو اردو کا واحد نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے۔ شارحوں اور مضمون نگاروں نے غالب کی محض مبالغہ آمیز یک رُخی تصویر پیش کرکے (یک رُخی بھی ایسی نہیں کہ محض حُسن کو دکھا دیا اور عیب کو چُھپا دیا بلکہ غضب یہ ہے کہ عیب پر بھی حُسن کا رنگ چڑھا کر) ملک میں وہ بدمذاقی پھیلائی ہے کہ اہلِ نظر حیران ہیں۔ یاالٰہی یہ کونسا طوفان ہے۔ آپ سمجھتے ہی ہوں گے کہ اس بد مذاقی کی ترویج کا کتنا بُرا نتیجہ مرتب ہو رہا ہے۔ قوم کی قوتِ فیصلہ مجروح ہوتی جارہی ہے۔ تمیز۔ نیک و بد معطل ہوتی جاتی ہے۔ بلکہ ہو چکی ہے۔ غالب کی لنگڑی

شاعری کو بھی ہوتی ذہنیتیں حُسنِ کمال پر محمول کرنے لگی ہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ جب ایسی گمراہی پھیلی ہوتی ہے تو کیا غالب کی تصویر کا دوسرا رُخ دکھا دینا یا رُباعیوں میں کچھ اشارے کر دینا ایک ادبی خدمت نہیں ہے۔ تہ دل سے اس خدمت کا اعتراف تو کیا کرتے اُلٹا الزام رکھا جاتا ہے دل دکھانے کا۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میری خدمتوں کا اعتراف کیا جاتے۔ میں خدمت، خدمت کی غرض سے کرتا ہوں حصولِ صلہ کے لیے نہیں کرتا۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ میری خدمت کا جو مقصد ہے وہ حاصل ہوتا جاتا ہے اور ہوتا جاتے گا مگر میرے حق میں یہ خدمت زحمت و رسوائی کا باعث ہوتی رہی ہے۔ مجھے دشمن و دوست کی پروا ہوتی تو ایسا کیوں کرتا۔ مگر ملک خود اپنی قوتِ فیصلہ کو مجروح کیے لیتا ہے۔ یہ کون سی عقل مندی ہے۔ مَیں غالب کی طرح دادِ سخن کا بھوکا نہیں ہوں کہ لوگوں کو منت کر کر کے پکار کر اپنے ڈھب پر لاؤں یا یہ کہوں "نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی"۔ کمال تو وہ ہے کہ مار گھونسوں کے داد وصول لیتا ہے۔ تو پھر ضمیر فروشی کرنے یا تالیفِ قلوب کی منافقانہ پالیسی برتنے کی ضرورت کیا ہے۔ داد تو مجھے ایسی ملی کہ زمین و آسمان گواہ ہیں۔ تمام شعرائے لکھنؤ عاجز آ کر میرا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہوتے سامنے آنا مُنہ دکھانا چھوڑ دیا۔ ذرا غور تو کیجئے اس سے بڑھ کر داد اور کیا ہو گی؟ بائیکاٹ کا فلسفہ یہی تو ہے کہ روندا ہوا دشمن جب ہر طرح عاجز آ جاتا ہے کوئی کاٹ نہیں کر سکتا تو بائیکاٹ کے حربہ پر اُتر آتا ہے۔ خُدا جانے میرے وہ کون سے قدردان ہیں جو نفسِ کمال کو غالب پرستی کے ساتھ مشروط سمجھتے ہیں کیا اچھی شرط ہے کہ مَیں غالب کی شان میں ایسی ظریفانہ رُباعیاں نہ کہتا اس کے عیب کو بھی ہنر سمجھتا یا کم از کم چھپاتے رکھتا تو میرا کمال کمال تھا اور نہیں تو نہیں!

غرض کہنے کی یہ ہے کہ نفسِ کمال غالب پرستی یا شخصیت پرستی پر توموقوف ہے

نہیں۔ کیا اچھے دوست ہیں جو میرے عیب ضمیر پرستی پر تو نظر رکھتے ہیں اور ہنر سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے اس چشم پوشی یا تعصبانہ تنگ خیالی کی کوئی شکایت ہے۔ ہرگز نہیں۔ نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تعلیم یافتہ گرا ہوں کا سارا گروہ میرا کلمہ پڑھنے لگے ہر کس و ناکس کو اپنے ڈھب پر لانا۔ اپنا چھوٹا ہوا خواہ بنانا میرا شیوہ نہیں ہے۔ جو ہر سخن کو جو پرکھ سکتا ہے وہ آپ سے آپ کھنچ آئے گا۔ باوجود ان عیوب کے جو مجھ میں ہیں۔ ملک میں ایک ایسا بے تعصب تعلیم یافتہ طبقہ بھی موجود ہے جو مجھے دوست رکھتا ہے۔ ہنر کو ہنر کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ غالب پرستی کے ساتھ مشروط نہیں سمجھتا۔ خدا جانے یہ مشروط قدردانی کیا بلا ہے؟ آل انڈیا شاعر کانفرنس کانپور میں اگر کسی شخص نے میرا یہ مصرع (وہ کون یگانہ؟ وہی غالب کے چچا!) نقل کر کے حاضرین مجلس کو بھڑکایا تو اس کی شکایت کیا؟ اس کی نگاہ بد بیں کا تقاضا یہی ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ترانہ کے تمام صفحات میں سے آخر کی انھیں پانچ سات مزاحیہ رُباعیوں کو کتاب کا ماحصل سمجھتا ہے گویا کتاب کا اصل موضوع یہی چند مزاحیہ رُباعیاں ہیں یا کم از کم لوگوں کو ایسا باور کرانا چاہتا ہے تو اس سے میرا یا آپ کا کیا بگڑتا ہے۔ ہاں ادبی دُنیا کو اس نے دھوکا دیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس کے اس طرزِ عمل سے آپ کے ساتھ اور لوگوں کو بھی (جو بقول آپ کے میرے قدردان ہیں اور اِک ادبی مجمع میں میرے متعلق اس سے بہتر ریمارک سُننا چاہتے تھے) تکلیف ہوئی۔ کیوں تکلیف ہوئی؟ یہ اپنی غلط فہمی۔ لوگ کیوں اس امر کے متوقع رہتے ہیں کہ ہر کس و ناکس ان کا ہمنوا و ہم خیال ہو جائے کیوں دوسروں سے میری نسبت "بہتر ریمارک سُننا چاہتے ہیں؟ کیا وہ خود کوئی رائے نہیں رکھتے؟ کیا اپنی رائے پر انھیں بھروسہ نہیں؟ اگر اپنی رائے کو حق بجانب سمجھتے ہیں تو کیا یہ احساسات بجائے خود اِک لذت نہیں ہے۔ اگر دوسروں کو بھی اس لذت

میں شریک دیکھنا چاہتے ہیں تو کچھ دنوں صبر کریں انتظار کریں۔ زمانہ خود کج رفتاروں کو سیدھا کر دے گا۔ بھلے کو لوگ خاموشی کے ساتھ میری نسبت "بہتر ربارک" سننے کے منتظر رہے خود کوئی کلمۂ خیر نہ کہا ورنہ جوشش بہی خواہی سے مجبور ہو کر پکار اُٹھتے تو نہ جانے کیا ہوتا؟ قدردانی کو ڈالیئے بھاڑ میں۔ یہ کیا غضب ہے کہ مجھ پر دل دُکھانے کا الزام رکھا جاتا ہے اور اس الزام کے ساتھ بہی خواہی کا احسان بھی جتایا جاتا ہے۔ کیا کہنا ہے اِس مفت کرم داشتن کا؟ کیوں حضرت مَیں نے دل کیوں کر دُکھایا؟ چور کو چور بے سرے کو بے سرا کہنا اگر دل آزاری ہے تو چور کو شاہ بنا کر پیش کرنا اِک پیٹ کے بندے، "خلعت کے بھوکے" کو صوفی کا مقدس خطاب دینا۔ سلطنت مغلیہ کے اِک خود غرض نمک خوار۔ انگریزوں کے پرستار و پنشن خوار کو "دھن پرست" ٹھہرانا اور اسی طرح کا بیسیوں سفید جھوٹ اہلِ نظر کی دل آزاری اور پبلک کی گمراہی کا سبب نہیں ہے؟ غالب شکن" (طبع اول) دیکھ کر اِک پروفیسر صاحب غالب پرستی کے جنون میں یہ بھی تحریر فرما گئے کہ ڈاکٹر اقبال، مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا حسرت موہانی نے شاعری کی جو اتنی منزلیں طے کر لی ہیں وہ کس کا صدقہ ہے؟ غالب ہی کا توفیض ہے۔" بھلا اس دیوانگی کا کیا علاج۔ خدا جانے مولانا محمد علی مرحوم کو شاعری میں کیا اعتبار حاصل تھا؟ اور نہ جانے مولانا حسرت موہانی نے شاعری میں کون سی منزلیں مار لیں؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کے ایک سچے دیانت دار لیڈر ہونے کے علاوہ مولانا حسرت اچھی خاصی مگر عاشقانہ غزل گوئی بھی کر لیتے ہیں اور اُردوئے معلیٰ کے ذریعہ سے اُردو کی خدمتیں بھی کی ہیں۔ مگر ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں میں "عاشقانہ" غزل گوئی کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ شرف جہاں قزوینی اور ہلالی ایران میں داغ دہلوی اور جرأت ہندوستان میں کوئی اعلیٰ درجہ کے غزل گو نہیں ہیں۔ غزل گوئی محض مرد و عورت کے جنسی تعلقات یا عاشقانہ زندگی کی

ترجمانی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ مشکل ترین صنف ہے جس میں زندگی کے بڑے بڑے اہم مسائل اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان کرنے میں اعلیٰ درجہ کی شاعرانہ قوتیں صرف ہوتی ہیں اور یہ اِک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مولانا حسرت ایک اوسط درجے کے خُوش گو ہونے کے سوا کوئی غیر معمولی شاعرانہ قوت نہیں رکھتے۔ منزلیں مارنا بڑے لوگوں کا کام ہے۔ اور یہ انکشاف کتنا انوکھا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اور مولانا حسرت نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ دیوان غالب ہی کا فیض ہے۔ گویا ان حضرات نے انگریزی فارسی لٹریچر سے کوئی فیض پایا ہی نہیں جو کچھ پایا دیوان غالب سے پایا۔ لاحول۔ اس بوالعجبی کا کیا ٹھکانا ہے اور سنیے آگرہ میں ایک صاحب مجھ سے ملے۔ گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کلیجے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ فرمانے لگے آپ نے بڑا ظلم کیا یہ کوئی ادبی خدمت نہیں ہے (یعنی غالب شکنی) غالب تو وہ شخص ہے جس کے آگے اُردو کے تمام شعرا (نام لے کر فرمایا) میر، سودا، درد، مومن، ذوق، آتش، ناسخ، انیس، دبیر یہ سب بحیثیت مجموعی ہیچ ہیں اور اس میں "ٹیپ کا بند" یہ تھا کہ جس طرح حضرت عمر نے اسکندریہ کا کُتب خانہ جلا ڈالنے کا حُکم دیتے وقت فرمایا تھا کہ قرآن جیسی کتاب موجود ہے تو پھر دُنیا میں کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ اِسی طرح میں کہتا ہوں کہ "دیوان غالب کے موجود ہوتے تمام اساتذۂ اُردو کا کلام، سارا اُردو لٹریچر آگ لگا دینے کے قابل ہے" خدا جانے یہ جوشِ عقیدت ہے یا دیوانگی؟ غور تو کیجئے اس قسم کی اشتعال انگیز بکواسیں کیوں کر برداشت کی جاسکتی ہیں۔ ایسی ہی بکواسوں کا یہ نتیجہ ہے کہ غالب شکنی ہونے لگی۔ افسوس ہے اس نادان نے غالب پرستی کے جنون میں اس الزام کو بھی تسلیم کرلیا جو حضرت عمر پر کُتب خانہ جلانے کے متعلق رکھا جاتا ہے۔ ارے یارو کیا غالب کے لیے یہ شرف کافی نہیں ہے کہ آخر عمر میں (میر تقی میر کی اقتدا کی بدولت) وہ اِک کامیاب شاعر تھا۔ اگرچہ اس کی عمر کا بیشتر حصّہ ذہنی سرگشتگی و حیرانی میں گزر گیا۔ کیا غالب کی

صحیح و جائز تعریفوں سے یاروں کا پیٹ نہیں بھرتا کہ اسے ناجائز و ناممکن معراج یا اچھالا دینے میں یہ مبالغہ کیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا انجام یہی ہوتا ہے کہ غالب جائز حد تک جس عزت کا مستحق ہے وہ بھی اس سے چھن جاتے۔ اس کی شاعرانہ بضاعت اس کے کیریکٹر اس کے طرزِ زندگی کی سختی سے جانچ ہونے لگے اور آخر کو یُوابندی کا یہ طلسم جو غلبچیوں نے باندھ رکھا ہے تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ جاتے۔ غلبچیوں کے دیوانہ وار عمل کا ردِّ عمل شروع ہو چکا ہے۔ کچھ دنوں میں ثابت ہوا جاتا ہے کہ غالب کو اُردو زبان کا واحد نمائندہ ٹھہرانا اس کے کلام کو سراسر الہامی اور ORIGINAL کہنا حاشیہ نویسی و شرح نگاری کا دھندا اختیار کرنا مصنوعی پروپیگنڈا ہے ادبی تجارت ہے۔ فارسی لٹریچر سے (جو غالب کا واحد ماخذ ہے کیوں کہ وہ فارسی کے سوا اور کوئی زبان جانتے ہی نہ تھے) بے خبری کا نتیجہ ہے۔ جوشِ عقیدت کی فریب کاری ہے۔ مان لیا جائے کہ مَیں غالب کو سخن دُزد۔ بے سرا وغیرہ کہنے میں حق بجانب نہ سہی۔ مگر مبدا۔ فیاض کسی کا ذاتی جوہر چھین نہیں سکتا محض اِس وجہ سے کہ وہ غالب پرست نہیں ہے۔ فطرت میرزا غالب کی اتنی ہوا خواہ تو نہیں ہے کہ میرزا یگانہ علیہ السلام کا ذاتی جوہر چند ظریفانہ رباعیوں یا "غالب شکن" لکھنے کی وجہ سے مٹا دے گی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مَیں اپنی شاعری کی نسبت لوگوں کی زبان سے "بہتر دیارک" سننے اور ہر دلعزیز بننے کی ہوس میں تعلیم یافتہ گمراہوں کی طرح مہملات غالب کو بھی آسمانی صحیفہ مان لوں اور اس طرح گمراہ غلبچیوں کی نگاہ میں جھوٹی اور ذلیل عزت حاصل کروں۔ کیا ایسی عزت جو ایک قسم کی بھیک یا رشوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ضمیر فروشی کر کے کوئی بھلا آدمی قبول کر سکتا ہے۔ ٹھوکر پر مارتا ہوں ایسی عزت کو جو غالب پرستی کے صدقے میں حاصل ہو۔ عرفِ عام میں جسے عزت کہتے ہیں کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اس عزت کو مَیں نے لکھنؤ میں کس طرح قربان کر ڈالا۔ کیا کیا گالیاں کھائیں مغلظات کیا کیا ہجویں سُنیں

کیا کیا مادی نقصانات اٹھاتے۔ لگی لگائی روزی اودھ اخبار کی ملازمت چھوڑی۔ یہ یہ غالب کا زمانہ نہیں ہے کہ دلی کا تخت الٹ جانے کے بعد بڑے بڑے درباری شاعروں کی قدردانی کرنے والے موجود تھے۔ فکرِ معاش کے لیے آج کل سی کشمکش نہ تھی۔ آج کل اپنے وطن میں ساٹھ روپے کی ملازمت ایک صاحب اہل وعیال کے لیے بڑی قیمتی چیز ہے۔ ایسی ملازمت کو اپنی اصول پرستی کے سبب ترک کر دینا اس زمانے میں (کہ شاعروں کو کوئی پوچھتا تک نہیں کیوں کہ شاعری ایک سند سمجھی جاتی ہے۔ نکمے پن کی۔ شاعر گویا عقل وخرد سے بالکل بیگانہ ہے دُنیا کا کوئی کام کر ہی نہیں سکتا) کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آج کل شاعروں کا کام فقط شعر کہنا نہیں ہے بلکہ بے روزگاری کا عذاب بھی جان کے ساتھ ہے اور اگر کوئی جگہ آسمان زمین کے قلابے ملانے کے بعد مل بھی گئی تو اس کی ذمہ داریاں اور سختیاں اٹھانا بھی ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ بجانے کتنے خداؤں کی پرستش کرنا پڑتی ہے۔ جنگل جنگل مارے مارے پھرو آج یہاں تو کل وہاں۔ نت نیا پنجرا۔ نت نیا دانہ پانی۔ ان جھنجٹوں کے ساتھ فن کو فن کی حیثیت سے کرنا۔ آرٹ کے جانکاہ مراحل طے کرنا کیا کہوں کس قدر مشکل ہے۔ اِس نفسانفسی کے دَور میں آرٹ کو مرتبہ کمال پر پہنچانا۔ بغض وعداوت کی قربان گاہ پر وجہ معاش کو بھینٹ چڑھا دینا بال۔ بچوں پر سختیاں اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور صبر کرنا۔ عمر بھر کا سرمایہ ایک اچھا خاصہ کتب خانہ (اس کے تلف ہوجانے کے رنج وغم کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں) بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آکر کوڑیوں کے مول لُٹا دینا۔ بال بچوں کو خدا کے حوالے کر کے دیس چھوڑ پردیس پکڑنا۔ پورب، پچھم، اتر، دکھن کٹے کنکوے کی طرح تپاتے پھرنا۔ اپنی ضمیر پرستی کے ہاتھوں اُلٹا موردِ الزام ہونا۔ یار و اغیار کے طعنے سُننا اور شربت کے گھونٹ کی طرح پی جانا غالب جیسے خود غرض درباری شاعر، پیٹ کے بندے، خلعت کے بھوکے، انگریزوں کے پرستار

پنشن خوار کا کام نہیں ہے۔ حوصلہ ہے ضمیر پرست ایذا پسندوں کا جو وجہ معاش کے ساتھ اپنی عزت عرفی کی قربانی بھی اپنے مشن کی خاطر گوارا کر لیتے ہیں اور آج کل کی ہولناک کش مکش زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ غدر میں فقط قید ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ نہ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ مجرد جیل چلے گئے، تو کون سی ایسی کڑی جھیلی۔ بیوی بچوں کا کچا ساتھ ہی نہیں جنگی تباہی و بربادی کا درد و غم وبال جان ہو سکتا۔ البتہ شخصی راحت میں خلل پڑ گیا ہوگا اور یہی جسمانی راحت غالب کے لیے بڑی چیز تھی۔ کتنی شرمناک بات ہے کہ غالب نے چار دن بھی بہادر شاہ کے نمک کا پاس نہ کیا۔ تخت اُلٹتے ہی انگریزوں کے وفادار نمک خوار قصیدہ گزار بن گئے۔ اک آج کل کے بندگان ادب ہیں کہ زندگی کی ہمت شکن کش مکش کے ساتھ ساتھ یار و اغیار کے طعنے سنتے ہیں اپنے ہنر پر عیب کا رنگ چڑھتے اور اپنی تصنیفات کے ساتھ مخاصمانہ سلوک دیکھ رہے ہیں اور دل ہی دل میں ہنستے ہیں کہ یہ مخالفت کتنے دنوں زندہ رہ سکے گی ؟ حاسدان لکھنؤ کی زبردست جماعت کا وہ زور و شور، وہ پروپیگنڈا بھی دیکھا اور آخر میں پشیمان ہوتے بھی دیکھ لیا۔ اب غالب پرستوں کا زور دیکھنا ہے۔ خدا نے چاہا تو ان بہکی ہوئی ذہنیتوں کو بھی نادم ہوتے راہ پر آتے دیکھ لوں گا۔ میں نہ دیکھ سکا تو آپ دیکھ لیں گے اور اس وقت اپنی رائے بدل دینے پر مجبور ہوں گے۔ بغیر سمجھائے آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ میں نے غالب پر جو کچھ بھی تمسخر یا تنقید کی ہے وہ کتنی صحیح اور کتنی ضروری تھی۔ تو یہی یہ تمسخر بھی اک ادبی خدمت ثابت ہو کر رہے۔ کیوں کہ فی الحقیقت یہ تمسخر کسی عداوت پر تو مبنی ہے نہیں بلکہ ذہنیت عامہ کی اصلاح کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دل لگتی باتیں دل لگی میں کہہ دی جائیں۔ وہ زمانہ کیا آپ کو یاد نہیں جب میرے اس مصرع پر دآبر دتے لکھنؤ خاک عظیم آباد ہوں) لکھنؤ میں قیامت برپا ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سنگسار کر دیا جاؤں

گا۔ مصرع چونکہ حقیقت حال کا ترجمان ہے اور نوک پلک سے اتنا درست کہ دلوں میں سوراخ کیے دیتا ہے۔ اس وجہ سے سارا لکھنؤ بلبلا اٹھا ورنہ کوئی ہوائی بات ہوتی تو ہنسی میں اڑ جاتی۔ غالب پر بھی جو تمسخر کیا گیا ہے وہ نرا تمسخر تو ہے نہیں تپے کی باتیں ہیں۔ دُکھتی رگ مسل دی گئی لوگ بلبلا اٹھے۔ پانی کہاں مرتا ہے نشیب میں۔ لکھنؤ کی شورش بے جا کا جو انجام ہونے والا تھا وہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ سب چند روزہ فتنے ہیں۔ زمانے نے آخر غوغائیانِ لکھنؤ کے منہ کیل دیے بولتی مار دی۔ ملک پر روشن ہو گیا کون کتنے پانی میں ہے۔ الٰہ آباد، بنارس، شاہ جہان پور، علی گڑھ وغیرہ کے مشاعروں میں ان لوگوں کی بائیکاٹ بازی کی مذموم کوششوں نے (جو کہیں بن پڑیں اور کہیں بیچ گئیں) آخر یہ دن دکھایا کہ لکھنؤ کا معیار تہذیب و اخلاق نگاہوں میں سُبک ہو گیا اور اسی کے ساتھ لکھنؤ کے ادبی اقتدار پر بھی زوال آ گیا اور اب یہ دیکھ کر مجھے صدمہ ہوتا ہے کہ میری دیکھا دیکھی ہر کس و ناکس لکھنؤ کے منہ آنے لگا ہے۔ بعض ایسے آفاقیوں کو بھی مَیں نے دیکھا ہے۔ جن کی زبان کی سوجھ بوجھ نک ستیں نکلی جن کی مایۂ بساط بس اتنی ہے کہ چند عاشقانہ اشعار خوش آوازی سے پڑھ کر مشاعروں میں رنگ جما لیا کرتے ہیں اور نام نہاد "مقبولیت" کے فریب میں آ کر خود کو کوئی چیز سمجھنے لگے ہیں۔ میر انیس جیسے خدائے سخن کی ٹکسالی زبان پر اپنے جہل مرکب کے سبب منہ آنے لگے ہیں۔ میر انیس کی شاعری کو شاعری نہیں بلکہ شیعیت کا پروپیگنڈا کہتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں ہر کس و ناکس کا حوصلہ اتنا کیوں بڑھ گیا ہے کب سے بڑھنے لگا اور بڑھتا گیا؟ جب سے مَیں نے آزادی کی جنگ چھیڑی۔ خود آزاد ہوا اور دوسروں کو بھی آزاد کرایا۔ "چراغِ سخن" میں اہل زبان اور زبان دان کا فرق فلسفیانہ اصول کے تحت دکھا کر ذہن نشین کر دیا کہ لکھنؤ اور دہلی کے باہر بھی اہل زبان بستے ہیں۔ تب یاروں کو ہوش آیا۔ آنکھیں کھلیں بیدار ہوتے۔ مگر میرے مسلسل

جہاد کا اِک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بہتیرے نا اہل بھی آزادی کی ہوس میں مطلق العنان ہو گئے - اپنے تئیں بھی کوئی چیز سمجھنے لگے - ورنہ اِس سے پہلے دوسرے صوبوں کا ذکر کیا خود یوپی والے گوش بر آواز لکھنو رہتے تھے مگر اب تو گونڈہ بھی آزاد ہو گیا۔ لکھنو کے ادبی اقتدار اور مرکزی حیثیت کو زوال میں دیکھ کر بیرون جات کے شعراء و اہلِ قلم کو مطلق العنان پاکر، لکھنو والوں کو دم مارنے کی مجال نہ ہوئی - سوان کھینچ گئے۔ البتہ میرے دوست خواجہ عشرت صاحب لکھنوی کا دل دُکھا۔ انھوں نے بعض ادبی رسالوں میں اس امر پر توجہ دلائی کہ کیوں زبان کا ستیاناس کیا جارہا ہے۔ لکھنو کی مرکزیت کیوں مٹائی جارہی ہے - زبان کا ایک مرکز ہونا ضرور ہے اور وہ مرکز لکھنو کے سوا اور کونسا شہر ہو سکتا ہے - مگر اب کون سُنتا ہے - ہُوا بگڑی تو بگڑی کوئی کیا جانتا تھا کہ لکھنو کا بُت پندار اِس طرح چکنا چور ہو جائے گا۔

خیر لکھنو تو اپنے کیے کو پہنچ چکا۔ اب عالمگیر غالب پرستی کے طوفان کا مقابلہ ہے اِس طوفان کا انجام بھی معلوم ہے۔ "آیاتِ وجدانی" اور "ترانہ" عالم شہود میں آچکا ہے غالب کے آسمانی صحیفے کا بھرم کُھلتا جاتا ہے۔ اب چچا جان کو بھتیجے کے پیچھے پیچھے چلنا پڑے گا - برابر چلنے کا موقع نہیں ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غالب اپنے صحیح مرتبہ سے گر جائیں گے - یہاں ناجائز طور پر جو آسمانی خلعت یاروں نے پہنا دیا ہے - وہ اُتر جائے گا۔ شارحین نے غالب کے ناقص اشعار پر (جو کاٹ کے پھینک دینے کے قابل ہیں) فضول حاشیہ آرائیوں سے ملک میں جو بدمذاقی پھیلا رکھی ہے اور تعلیم یافتہ گراہوں نے اُردو کی دُنیا میں قحط الرجال کی شرم محسوس کرکے خواہ مخواہ غالب کو سوانگ بنا کر یونان و جرمنی کے فلاسفروں سے بھڑا دینے کا جو مضحکہ انگیز شیوہ اختیار کیا ہے۔ اس کی ٹھیک نکلنے ہی کو ہے۔ مَیں نے گزشتہ بیس سال کی مدت میں مختلف مضامین کے ذریعہ سے غالب کی شاعری کے مجروح پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے سوا ان کے

کریکٹر سے زیادہ بحث نہیں کی جس پر خود ان کے مکتوبات اور قصائد وغیرہ سے روشنی پڑتی ہے اور "قاطع برہان" تو غالب کی بدلگامی و بدزبانی کی روشن مثال ہے غالب کی دیکھا دیکھی مجھے بھی کھری کھری سُنا دینے کی عادت پڑ گئی۔ اس امر خاص میں مجھ پر غالب ہی کا پرچھاواں پڑا ہے۔ لوگوں کو میری اس عادت سے نفرت ہے اور ہونی چاہیئے تو غالب سے اور زیادہ نفرت ہونی چاہیئے کہ وہ اس فن (تلخ نوائی) کے امام ہیں۔

رکھیو غالب مجھے اِس تلخ نوائی سے معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ غالب کے کریکٹر پر مَیں نے کوئی خاص تنقید نہیں کی مگر زمانہ میں عمل کے بعد ردعمل کا قانون اٹل ہے۔ پنڈولم اپنی حد کو پہنچ کر پلٹا ضرور لے گا۔ غالب شاعروں میں شاعر۔ رئیسوں میں رئیس۔ درباریوں میں درباری صوفیوں میں صوفی، رندوں میں رند، فلاسفروں میں فلاسفر، سپاہیوں میں سپاہی وطن پرستوں میں وطن پرست۔ آخر یہ ہے کیا بکواس؟ ان بے سروپا ہذیانات کو دیکھ کر آخر ڈاکٹر عبداللطیف پی ایچ ڈی۔ پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے غالب کے نظریہ زندگی اور ان کے کیریکٹر کو تنقید کی کسوٹی پر کس کر دکھا دیا کہ غالب کی حقیقت کیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی معرکہ آرا کتاب (غالبؔ) پر بہت کچھ چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ مگر حقیقت آخر حقیقت ہے۔ زبان سے کوئی کتنا ہی انکار کرے حقیقت کا وزن دلوں پر اتنا پڑتا ہے کہ چھپائے نہیں چھپتا۔

لگے ہاتھوں یہ بھی بتاتا چلوں کہ غالب کی شاعری کے کمزور پہلو اور ان کے قابل الزام کیریکٹر پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کے جواب میں جو صفائی پیش کی جاتی ہے وہ کتنی خوبصورت ہوتی ہے۔ کتنا بھولا پن ٹپکتا ہے غالب پرستوں

کے جواب سے ۔ غالب کی چوریوں کا جب قطعی ثبوت پیش کر دیا جاتا ہے اور مال مسروقہ بھی سامنے رکھ دیا جاتا ہے (یعنی فارسی لٹریچر کا وہ حصّہ جس سے غالب کے بہتیرے اشعار ماخوذ ہیں یا چُرا لیے گئے ہیں یا بطور ترجمہ اُردو کے قالب میں ڈھال لیے گئے ہیں ۔ ترجمہ کہیں بن پڑا ہے کہیں بگڑ گیا ہے اور اتفاقاً کہیں اصل سے زیادہ چُست اور خوبصورت بھی ہو گیا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ غالب کے سارے کلام کے متعلق ڈنکے کی چوٹ ORIGINALITY کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے کم ازکم یہ دعویٰ تو مال مسروقہ کی موجودگی میں لغو و باطل ٹھہرتا ہے ۔ کیوں کہ سیکڑوں برس پہلے سے وہ مضامین فارسی لٹریچر میں موجود ہیں ۔ کیا غالب فارسی لٹریچر سے بے خبر تھے کہ ان چُراتے ہوئے مضمونوں کو توارد کی آڑ پکڑ کر غالب ہی کا نتیجہ تخیل کہا جا سکے ؟ البتہ شیکسپیئر اور ملٹن کے کلام سے کسی خاص مقام پر توارد ہو جائے تو توارد کہہ سکتے ہیں ۔ کیوں کہ وہ انگریزی سے ناواقف تھے ۔ یہ بحث جداگانہ موقع پر کی جائے گی کہ غالب کے کن کن اشعار پر توارد کا حکم لگایا جا سکتا ہے اور کن کن اشعار سے کھُلا ہوا بے ڈھنگا سرقہ ثابت ہے ۔ اصل و نقل کو سامنے رکھ کر حقیقت کھُل سکتی ہے ۔) مال مسروقہ سامنے رکھ دیا جاتا ہے تو غالب کے وکیل اس الزام کو تو رد کر سکتے نہیں کیونکہ مال مسروقہ برآمد ہی ہو گیا ۔ بڑی غیرت داری ، بڑی معصومیت سے یہ جواب دیتے ہیں ۔ جواب کیا دیتے ہیں سر کی بلا ٹالتے ہیں خفت مٹاتے ہیں کہ ترجمہ و سرقہ وغیرہ کی مثالیں عموماً تمام شعراء کے ہاں پائی جاتی ہیں جو غالب پر کیا دوش ہے ۔ واہ ، واہ ، واہ ۔ کہاں تو غالب تمام شعراء سے الگ ایک آسمانی حیثیت رکھتا ہے اور کہاں عام شعراء کی طرح اس کے کلام میں بھی چوریاں تسلیم کی جاتی ہیں ۔ کہاں تو سراسر الہام اور ORIGINALITY کے وہ بلند آہنگ دعوے اور کہاں یہ الزامی جواب کچھ بناتے نہ بنی تو دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے ۔ چوریوں کے

علاوہ اغلاط فاحش اور بد مذاق کی مثالیں اِس کثرت سے غالب کے ہاں ہیں کہ الٰہی توبہ۔ مگر ان کے ہوا خواہ غلطی کو غلطی بد مذاقی کو بد مذاقی تسلیم ہی نہیں کرتے۔ گویا غالب تمام حدود فن سے باہر نہیں بالا ہیں۔ واہ ری اندھی عقیدت! بعض یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں۔ مگر یہ الزامی جواب (مبالغہ آمیز دعووں کے سامنے) غلبیوں کی انتہائی عاجزی کی دلیل ہے۔ غالب کے سر سے الزام اُتر نہ سکا تو دوسروں پر بھی الزام رکھ دیا۔ اپنے ساتھ اوروں کو بھی سان لیا۔ ارے میاں دوسروں سے غلطی ہوتی ہے اور ہو گی کیونکہ وہ انسان ہیں مگر غالب انسان تو ہیں نہیں وہ ٹھہرے آسمانی دیوتا وہ کیوں ایسی ٹھوکریں کھائیں؟ ذرا غور تو کیجئے جب غالب کی شاعری زیرِ بحث ہوتی ہے۔ تو اس وقت وہ گویا آسمان کے تارے توڑ لاتا ہے اوروں کا جو آسمان ہے وہ غالب کی زمین ہے (واللہ کیا بے پَر کی اُڑاتے ہیں) اس کا کلام سراسر الہامی ہے۔ آسمانی صحیفہ ہے وغیرہ وغیرہ جملہ اساتذہ کی سطح سے وہ اتنا بلند دکھایا جاتا ہے گویا وہ اِس دُنیا کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ کوئی فوق البشر ہستی ہے۔ اس کا فلسفہ زیرِ بحث ہوتا ہے (خدا جانے غالب کا فلسفہ کیا بلا ہے سوا اس کے کہ میرزا صائب وغیرہ کے ہاں سے چند فلسفیانہ نکتے اُڑا لیتا ہے اور بس) تو وہ ایک پلّے میں رکھ دیا جاتا ہے اور یورپ کے تمام فلاسفر دوسرے پلّے میں بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ گویا اتنا بڑا فلاسفر ہے۔ اس سفید جھوٹ کا کیا جواب۔ خیر ہو گا! ہمیں اس سے کیا مطلب مگر دل لگی تو یہ ہے کہ جب ایسی فوق البشر ہستی کی کھلی ہوئی بے ڈھنگی چوریاں یا ترجمے پیش کر دیئے جاتے ہیں تو وہی شخص گویا آسمان سے قلا بازیاں کھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہندوستان کے دیگر بے مایہ شاعروں کی طرح چوریوں کا بھی مرتکب ہوتا ہے فوق البشر کے درجہ سے گر کر بشر ہو جاتا ہے اور ایک حمام میں سب ننگے کا مصداق ہو کر گویا چوری کے الزام سے بری

سمجھا جاتا ہے۔ اے ماشاء اللہ جس کے افکار سراسر الہامی اور ORIGINAL کہے جاتے ہیں وہی دوسروں کی طرح چوریاں بھی کرتا ہے۔ یعنی وہی کلام مسروقہ بھی ہے اور ORIGINAL بھی (سبحان اللہ) وہی آسمانی دیوتا عام شاعروں کی طرح غلطیاں بھی کرتا ہے۔ ٹھوکریں بھی کھاتا ہے اور بہ ضرورت خاص یعنی رفع الزام کی خاطر عام شعراء کے گروہ کا ایک فرد ٹھہرایا جاکر قابل معافی بتایا جاتا ہے اس کا عیب تو عام شعراء کے معیار پہ پرکھ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور اس کا ہنر گویا خاص الخاص آسمانی چیز ہے۔ خدا جانے یہ کون سی منطق کون سا فلسفہ ہے؟ یہ ساری منطق ہم ایسے سیدھے سادے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے وضع ہوئی ہے میں پوچھتا ہوں اگر کوئی پیغمبر۔ کوئی فلاسفر۔ عام مجرموں کی طرح گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو تو کیا اس کی وہی سزا ہوگی اس کے ساتھ وہی رعایت کی جائے گی جو عام مجرموں کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ زیادہ اور بہت زیادہ سزا کا مستحق ہے۔ کیونکہ اس کا اخلاق عام سطح سے بہت بالا ہونا چاہیئے۔ پس غالب کی نسبت بے سروپا اتہام فضیلت کو پیش نظر رکھ کر، ان کی شاعرانہ چوریاں۔ درباری شاعروں کی طرح خلعت فاخرہ کی تمنائیں۔ انگریزوں کی خوشامدیں نہایت قابلِ نفرت ہیں۔ دوسرے شعراء چوری کرتے ہیں جھک مارتے ہیں تو غالب جیسے آسمانی دیوتا دوسروں کی طرح کیوں جھک ماریں۔ ان کا اخلاق عام سطح سے بالا ہونا چاہیئے تھا مگر ایسا تو نہیں ہے ہرگز نہیں ہے۔ میر تقی میر۔ میر انیس۔ خواجہ آتش کے سامنے وہ اخلاقی اعتبار سے ، میرزائیت کے اعتبار سے بہت پست ہیں۔ موخرالذکر بزرگواروں کی مردانہ و شریفانہ زندگی سے غالب کی خود غرضانہ و بوالہوسانہ زندگی کا مقابلہ کر دیکھیئے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟

شاعرانہ چوری اور مطلبی (قصیدہ بازی) کے علاوہ غالب میں ایک بڑا نقص یہ بھی

تھا کہ وہ اپنے نطری جوہر اپنی اعلیٰ دماغی استعداد کا صحیح مصرف نہ لے سکے۔ تلون مزاجی اور شاعرانہ بوالہوسی کے ہاتھوں ان کی ذہنی زندگی کا بیشتر حصہ حیرانی و سرگشتگی میں گزر گیا۔ آج وہ میرزا جلال اسیر کے مقلد ہیں تو کل شوکت بخاراتی کے کبھی عُرفی کی نقالی کرتے ہیں کبھی نظیری کی۔ کبھی بیدل کا پیالہ چاٹتے ہیں کبھی صائب کا۔ کبھی کسی کا۔ زمانہ دراز تک ان کی طبیعت نے کوئی خاص رنگ پکڑا ہی نہیں۔ کسی مرکز پر قرار ہی نہیں۔ آئے دن رنگ بدلتے رہے۔ آج ایک کو اپنا لیڈر بنایا کل دوسرے کو۔ پرسوں تیسرے کو چنانچہ خود ان کا کلام سر سے پاؤں تک اسی حقیقت کا شاہد ہے، اور یہ شعر تو صاف صاف ان کے تلوّن کی چُغلی کھاتا ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خُدا بھلا کرے نکتہ چینیوں کا جن کے تشدد سے تنگ آکر آخر عمر میں میر تقی میر کو اپنا امام بنایا جب کہیں راہ راست پر آتے چنانچہ اپنے مکتوب میں خود اس امر کا اقرار کیا ہے کہ "میں تو میر کے رنگ میں در آیا اور مومن خاں اپنی راہ چل پڑے"۔ وہی آخر عمر کا کلام جو میر کی تقلید اور اپنے واردات قلبی کے تحت کہا گیا ہے غالب کی شاعری کی جان اور اُردو لٹریچر کا سرمایۂ ناز ہے۔ اس پر اردو جتنا چاہے فخر کرے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاّ ! یورپ کی ذہنی روشنی میں غالب کو دیکھنا کتنا غلط اور گمراہ کن اصول ہے۔ بھلا یورپ کی فضا سے غالب کے ذہن کو کیا تعلق ؟ غالب کی نشو و نما ہندوستانی اور ایرانی لٹریچر کی فضا میں ہوئی۔ فارسی لٹریچر کی روشنی میں غالب کے کلام پر صحیح تنقید ہو سکتی ہے۔ یورپ کے فلاسفروں سے بھڑانا محض اِک طفلانہ بوالعجبی ہے غلبچیوں نے فارسی لٹریچر کو تو پس پُشت ڈال دیا اور لگے یورپ کی روشنی میں غالب پر رنگ چڑھانے ! فارسی لٹریچر کو سامنے رکھ کر تنقید کرتے

دکرتے کیونکر ؟ انگریزی کے گریجویٹ کو اہلِ عجم کے کارناموں کی کیا خبر؟) تو کبھی دیوان غالب کو آسمانی صحیفہ، سراسر الہامی اور ORIGINAL نہ کہہ سکتے (فارسی لٹریچر کا سمندر پیر جاؤ تو معلوم ہو غالب کی پونجی کیا ہے) غالب زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال دقت پسند گمراہ شاعر ہے جو آخر عمر میں راہ پر آیا مگر صبح کا بھولا شام کو آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ ڈاکٹر عبداللطیف کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ غالب کوئی بڑا شاعر نہیں ہے۔ غالب اُردو کا بڑا شاعر ہے اعلیٰ درجہ کا غزل گو۔ ایشیا میں بڑا شاعر وہی نہیں ہے جو ملٹن کی فردوس گم گشتہ جیسی طویل و مسلسل نظم لکھ ڈالے۔ ایشیائی شاعری میں غزل گوئی کی صنف سب سے زیادہ مشکل سب سے زیادہ آسان سب سے زیادہ بکار آمد سب سے زیادہ فضول بھی ہے۔ اب یہ شاعر کی استعداد پر موقوف ہے کہ غزل کو ذلیل کردے یا معراج پر پہنچادے۔ غالب نے غزل کو ذلیل بھی کیا اور اس کے معیار کو بلند بھی کردیا ہے۔ مگر صوفی اور وطن پرست کا خلعت پہنانا تو نہایت مضحکہ انگیز پروپگنڈا ہے۔ جاہلانہ عقیدت ہے۔ غالب میں تو اوسط درجہ کی خودداری، وضع داری اور میرزائیت بھی نہ تھی جو اس زمانے کے شرفاء کا عام چلن تھا۔ غالب اور وطن پرستی؟ ارے میاں کہاں کی وطن پرستی؟ وطن پرستی کا علمی ثبوت تو لکھنو کے شہدوں نے دیا کہ واجد علی شاہ بہادر کے معزول ہونے کے بعد میرزا برجیس قدر بہادر کو زبردستی تخت پر بٹھاکر انگریزوں سے لڑتے رہے اور چھ مہینے تک میرزا برجیس قدر بہادر شاہ بنے رہے بعد ازاں جو ہونا تھا سو ہوا اور یہاں تو یہ حال ہے کہ دتی کا راج لُٹ گیا۔ بہادر شاہ قید ہو کر رنگون سدھارے کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی "مرزا وطن پرست" کو اپنے حلوے مانڈے کی پڑی تھی۔ خلعت و پنشن۔ جیغہ و سر پیچ و مالائے مروارید کی ہوس دامنگیر تھی۔ بڑھاپے میں لاٹ صاحب کے دربار میں

شریک ہونے کی ہوس دل میں رہ گئی۔ خود فرماتے ہیں کہ میرے پاس زر ہوتا تو میں باوجود اس پیرانہ سالی وضعف و نقاہت کے لاہور جاتا لاٹ صاحب کے دربار میں شریک ہوتا۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں داغ حسرت لیے جاتا ہوں۔ سلطنتِ مغلیہ کا نمک خوار اور اس کا یہ کردار ؟ لاحول۔ غور تو کیجئے کیا صوفی ایسے ہی ہوتے ہیں ؟ وطن پرستوں کی یہ شان ہے ؟ اک آزاد حقیقی شاعر کے خیالات اور ارادے اتنے پست ہو سکتے ہیں ؟ اک خواجہ آتش تھے کہ بادشاہ نے خلعت و نقدان کے گھر بھیجا شہزادہ کی تقریب شادی میں شرکت کی دعوت بھیجی مگر خواجہ صاحب نے سب اُٹھا واپس کر دیا کہ میری طرف سے بہت بہت تسلیم عرض کرنا اور یہ کہنا کہ اگر میں شریک ہوتا تو کچھ نوید ضرور دیتا۔ پس میری طرف سے یہی نوید تصور فرمائی جائے۔ مگر میں حضوری سے مجبور ہوں۔ سبحان اللہ! کجا یہ شان مردانگی ! کجا وہ ہوس درباری آدمی آدمی انتر۔ کوئی ہیرا کوئی کنکر۔

عجیب دل لگی ہے۔ غالب کی شان میں چند مزاحیہ رباعیوں نے یاروں کا مزاج کچھ ایسا بحال کر دیا ہے کہ سڑی سودائیوں کی طرح بنکارتے پھرتے ہیں اور میں دُور سے بیٹھا تماشے دیکھا کرتا ہوں۔ ایک دِلّی وال صاحب تاؤ میں آکر مجھے لکھتے ہیں کہ اب بھی غالب کے ساتھ نیش زنی سے باز نہ آئے تو آپ کی شاعری کا قلع قمع کر دیا جائے گا۔ مگر یہ دھونس بہت پُرانی اور فرسودہ ہو چکی ہے۔ بیس برس سے سُنتا آرہا ہوں۔ اس کان سُنتا ہوں اور اس کان اُڑا دیتا ہوں۔ اگر میری شاعری کا "قلع قمع" کر دینا آسان ہوتا تو یاران لکھنو دبک کر بیٹھ نہ رہتے۔ دکی وال صاحب سے کوئی پوچھے کہ میرزا غالب پر سنجیدہ یا مزاحیہ نکتہ چینی کا حق میں نہیں رکھتا تو اور کون رکھتا ہے ؟ اور یہ تو فرمائیے آپ غالب کی مدح سرائی کا کیا حق رکھتے ہیں ؟ کیا سچ مچ آپ میرزا غالب کے کمالات کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں ؟ غالب کے ساتھ نسبت قریب آپ

کو حاصل ہے یا اس شخص کو جو غالب کا چچا بھی ہے اور بھتیجا بھی۔ جسے دُنیا اپنی کوتاہ نظری سے غالب کا دشمن سمجھ رہی ہے اور یہ امر ممکن ہی نہیں کیوں کہ شاعر شاعر کا دشمن تو ہو سکتا ہے (بشرطیکہ دونوں ہمعصر ہوں) مگر شاعر کے کمال کا دشمن ہونا ناممکن بات ہے۔ مَیں گزشتہ بیس سال سے دُنیا کی نگاہ میں اپنے تئیں بظاہر غالب کا دشمن ثابت کرتا رہا ہوں اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی یہی دل لگی کرتا رہوں مگر بقول بسمل سندیلوی ؎

یہ راز کی باتیں ہیں کوئی اسے کیا سمجھے
بُت سامنے رکھ لینا اور یادِ خُدا کرنا

مجھے ساری دُنیا سے کیا مطلب ؟ مطلب ہے تو بس اتنا کہ بظاہر دُنیا کو احمق بناؤں مگر در پردہ بگڑے ہوئے مذاقوں کی اصلاح کروں) اور دُنیا مجھے احمق سمجھے میری حماقتوں پر کھسیانی ہو کر جامے سے باہر ہو ہو جائے۔ مجھے اس میں مزہ آتا ہے۔ غالب کی شان میں میری مزاحیہ رباعیاں اور غالب شکن گُل افشانیاں بظاہر "ادبی معصیت" سہی مگر وہ دن دُور نہیں جب یہی معصیت اِک ادبی خدمت ثابت ہو کر رہے گی اور آج بھی یہ صدائے بے ہنگام فضول نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ تعمیری کام کر رہی ہے۔ بقول میرزا یگانہ علیہ السلام۔

یگانہ وار ایک ہی رُخ سے نہ دیکھئے
دُنیا کے ہر مشاہدۂ ناگوار کو !

غالب کی "تعمیر میں صورت خرابی مضمر ہے" تو یہاں تخریب میں تعمیر مضمر ہے۔ مگر ان حقیقتوں تک پہنچنا ایسے ویسے غلچیوں کے نصیبوں میں نہیں۔ شاعر حقیقی اِک ایسا مصلح ہوتا ہے جس کی خدمات کا اعتراف کرنے میں دُنیا ہمیشہ بخل و تجاہل سے کام لیتی ہے۔ سچ کہا ہے شیلے نے :-

POETS ARE THE UNACKNOWLEDGE LEGISLATORS OF THE WORLD.

بندہ نواز۔ میری شاعری کا "قلع قمع" کر دینے کی نسبت جو ارشاد ہوا ہے بجا و درست ہے۔ مَیں بھی آپ کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے حاضر ہوں۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ دلّی اور دلّی والوں کے ساتھ عموماً اور میر، سودا، درد اور حضرت امیر خسرو کے ساتھ خصوصاً جو عقیدت خاکسار کو ہے کیا اس عقیدت کا کوئی صلہ بھی عطا فرمایا جائے گا؟ بدی کی سزا کا مستحق ہوں تو کیا نیکی کی جزا میں میری شاعری کو چار چاند لگا دینا بھی آپ کا فرض ہے کہ نہیں۔ آپ کا ایمان کیا کہتا ہے؟ مَیں گنہگار سہی مگر کیا خُدا نے کوئی ایسا بندہ بھی پیدا کیا ہے جس نے گناہوں کے سوا کوئی عمل خیر کیا ہی نہ ہو۔ اگر خاکسار سے کوئی عمل خیر ہُوا ہے تو غالب کے ساتھ "ادبی معصیت" کی وجہ سے میزان عمل کے کسی پلّہ میں اسے جگہ نہ ملے گی؟ ذرا اپنے ضمیر سے مشورہ تو کیجئے کہ یگانہ نے اُردو شاعری کے معیار کو بُلند کر دیا ہے یا پست؟ اگر اُردو کی کوئی خدمت منظور کی ہے تو کیا اس کی جزا غالب کی پرستش بے جا کے ساتھ مشروط ہے۔ کیا غالب ہی کے صدقے میں عمل خیر کی جزا ملے گی۔ اگر ایسا ہے تو مجھے سزا کی پروا ہے نہ جزا کی۔ دُنیا تو کیا ہے مَیں خدا کے سامنے بھی کہہ دوں گا کہ میر تقی میر کی پاک و پاکیزہ شاعری۔ ان کی خودداری ان کی شریفانہ زندگی کا جتنا احترام کرتا ہوں ہرگز غالب کا اِتنا احترام نہیں کر سکتا۔ میر کے آگے سر تسلیم خم ہے مگر میرزا غالب کے ساتھ تو ہی چچا بھتیجے کی نوک جھونک چلے گی۔ یہ دونوں مقطعے یاد رکھیئے،

مُردہ ایک لکھنؤ میں بھی ہے
وہی مرزا یگانہ غالب جنگ

میر کے آگے زور کچھ نہ چلا
تھے بڑے میرزا یگانہ دبنگ

یاد رکھیے بڑے لوگوں کی بڑی بات۔ غالب کے ساتھ میرزا یگانہ علیہ السلام کا تمسخر بھی عوام شکستہ لگام کی کورانہ رفتارِ عقیدت سے بہت بالا ہے۔ سبق آموز ہے۔ قابلِ قدر ہے۔ افادی حیثیت سے بھی اور شاعرانہ آرٹ کے اعتبار سے بھی۔ اس حقیقت کی تہ کو پہنچنے کے لیے چشم بینا چاہیے کہ میرزا یگانہ کا تمسخر غالب کے ساتھ فی الحقیقت تمسخر کی راہ سے ہے یا اس میں کوئی ادبی خدمت کا جذبہ پوشیدہ ہے۔ اوچھے خیالات اور سطحی نظر رکھنے والے اس تمسخر کو شہرت طلبی پر محمول کریں تو کریں مگر میرزا یگانہ تو وہ شخص ہیں کہ حصول شہرت و شوق ہردلعزیزی تو کجا اپنے اعزاز عرفی کو گزشتہ بیس سال سے مسلسل نقصان پہنچا رہے ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے اعزاز و وقار کو لٹاتے رہتے ہیں۔ دوستوں کو بھی دشمن بنا لینا ان کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ جس دوست کی دوستی غالب پرستی کے ساتھ مشروط پائی گئی۔ سمجھ لیا کہ یہ دوستی کچے دھاگوں سے بندھی ہوئی ہے۔ ایسا بودا رشتہ کس کام کا اس کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے۔ بقول جناب آرزو لکھنوی ؎

اس رشتۂ خام کو ذرا کس کے بھی دیکھ
بودا ہے اگر تو ٹوٹ جانا اچھا!

یہاں ایک اور امر قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ ملک میں اور جتنے مشاہیر عصر ہیں ان میں سے کسی کے خلاف ایسی سخت برہمی نہیں پائی جاتی جیسی میرزا یگانہ کے خلاف پائی جاتی ہے۔ مگر یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے شیوۂ استمالت۔ مصلحت بینی، زمانہ سازی اور دلربایانہ انداز سے پبلک کو رجھا کر اپنی شاعری کو چمکا لیا ہے۔ برخلاف اس کے میرزا صاحب بجائے تسخیرِ قلب کے ہمیشہ جذباتِ عامہ کو کچلتے رہتے ہیں۔

اِس پر بھی میرزا صاحب کا اثر و اعتبار گھٹتا تو کیا بڑھتا ہی گیا دونوں فریقوں کے اعتبار و اثر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک صلح سے تسخیرِ قلب کرتا ہے دوسرا تشدد سے اپنا لوہا منواتا ہے۔ اِس چنگیزی ذہنیت پر عرفی نے کیا خوب کہا ہے۔

بہ ملک وقت ما رُو نہادہ سلطانے
کہ ما بہ صلح دہیم او بہ جنگ می گیرد

دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے دو انجن پٹڑیوں پر برابر دوڑ رہے ہیں اور دونوں کے پیچھے اور ایک ایک انجن لگا ہوا ہے۔ انجن نمبر ۱ کے ساتھ جو انجن لگا ہوا ہے وہ اسے پیچھے گھسیٹ رہا ہے اور انجن نمبر ۲ کے ساتھ جو انجن ہے وہ اسے آگے ڈھکیل رہا ہے (یہ ہے پبلک کی خوشنودی) مگر انجن نمبر ۱ مخالفانہ کشاکش سے پیچھے تو کیا ہٹتا آگے ہی بڑھتا جاتا ہے اور انجن نمبر ۲ کو تو آگے بڑھنا ہی چاہیے کہ پیچھے سے ڈھکیلنے والا بھی موجود ہے۔ مگر ایک وقت آئے گا کہ پچھلے دونوں انجن الگ ہو جائیں گے۔ اس وقت دونوں کی حقیقی طاقت رفتار معلوم ہو جائے گی! میرزا صاحب سے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ملک کی ادبی بد مذاقی اور پبلک کی گمراہی کو آنکھوں سے دیکھیں اور خاموش رہیں اِس خوف سے کہ غالب کے خلاف آواز بلند کی تو ملک دشمن ہو جائے گا۔ میرزا صاحب اِتنے بودے ہوتے تو غریب اردو کا حق کون ادا کرتا؟

ذاتی اعزاز و وقار کو جو شخص اپنے حسنِ نیت و حُسنِ عمل کے ساتھ وابستہ جانتا ہو اسے اعزاز عرفی کی قربانی کرنے میں تامل کیوں ہوتا؟ میرزا صاحب کو کیا معلوم نہ تھا کہ غالب کے خلاف قلم اُٹھانے کا انجام کیا ہوگا اور پہلے معلوم نہ تھا تو گزشتہ بیس پچیس سال کے تجربے نے تو ضرور بتا دیا ہوگا۔ مگر دُنیا دیکھ رہی ہے کہ میرزا یگانہ آج بھی اپنے جادۂ مستقیم سے ہٹے نہیں۔ حصول اعزاز و شہرت کے بدلے آج بھی وہ اپنے اعزاز و وقار کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہے ہیں۔ آخر یہ کیوں؟ کیا دماغ

خراب ہے ؟ جی نہیں۔ دماغ تو اتنا صحیح ہے کہ دُور سے بیٹھے بیٹھے اِک ذرا سی چونچ بتا دی اور ہزاروں قلبیوں کو سٹری بنا کے جامے سے باہر کر دیا۔ بات یہ ہے کہ جو شخص اعزاز و وقار کو اپنی ذات کے ساتھ وابستہ جانتا ہو اپنی ذات سے خارج نہ سمجھتا ہو اسے پبلک کی خوشنودی یا برہمی کی پروا کیوں ہونے لگی ؟ وہ تو اپنے فرائض ادا کر کے رہے گا۔ اسے معلوم ہے کہ سچی عزت جڑ کی طرح اندر ہی اندر پھیلتی ہے اور جھوٹی عزت پھولوں کی طرح چار دن کی بہار دکھا کر خاک میں رل جاتی ہے۔ مزہ تو جب ہے کہ غالب شکنی اور پبلک کی دل آزاری کے بعد بھی حقیقی شاعرانہ اعتبار جڑ کی طرح اندر ہی اندر پھیلتا جاتے۔

مائی ڈیئر مسعود صاحب کیا کہوں سخت افسوس ہے کہ ملک کی قوت فیصلہ و تمیز نیک و بد کو مختل و معطل دیکھ کر مجھے غالب کے کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالنی پڑی۔ وہ انیسویں صدی کے میں بیسویں صدی کا نہ ساحرانہ چشمک نہ خاندانی بیر۔ میں کہتا ہوں اور کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ تعلیم یافتہ گمراہوں کی بہ نسبت غالب کے کمالات شاعرانہ کی صحیح قدر شناسی کا جوہر فطرت نے مجھ میں زیادہ ودیعت کیا ہے۔ شاعر کو بحیثیت شاعر، شاعر ہی خوب سمجھ سکتا ہے۔ مگر یہ ضرورت خاص۔ یعنی ملک کی بڑھتی ہوتی بدمذاقی کی روک تھام کے لیے غالب کے متعلق اِس قدر تلخ حقیقتوں کا انکشاف واجب سمجھتا ہوں کہ غالب پرست ذرا حقیقتِ تلخ کا بھی مزہ چکھ لیں۔ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتا کہ جو لوگ گئے گزرے ہو چکے ان کی خلقی کمزوریوں کو بھانا سخت کم ظرفی و خباثت کی دلیل ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ اس عیب کو عیب نہیں سمجھتا کیوں کہ مخاصمانہ جذبہ کارفرما نہیں ہے بلکہ میں اپنا ادبی و قومی فرض سمجھتا ہوں کہ غالب کی تصویر کا دوسرا رُخ دکھا دوں۔ مانا کہ غالب کی شخصیت نہایت محترم ہے مگر غالب سے بھی زیادہ محترم کوئی شے ہے اور وہ ملک کا ادبی مذاق ہے۔ محض

غالب پرستی کی خاطر ملکی مذاق کی تباہی گوارا نہیں کی جا سکتی۔ دُنیا کے بڑے سے بڑے مورخین بڑے بڑے لوگوں کے اعمال نیک و بد دونوں پر روشنی ڈالتے چلے آئے ہیں تاریخیں، تذکرے، سوانح عمریاں بھری پڑی ہیں۔ اسلاف کے اخلاق و عادات اور ان کی زندگی کے کارنامہ ہائے نیک و بد سے۔ اگر تصویر کے دونوں رُخ دکھائے نہ جاتے تو اگلے لوگوں کی کمزوریوں اور خامیوں سے سبق حاصل کر کے دُنیا اصلاح و ترقی کی طرف کیوں کر قدم بڑھا سکتی ؟

میرے اُستادِ اعظم صلعم نے فلسفۂ عمل کو دو لفظوں میں سمجھا دیا ہے "الاعمال بالنیات" اس سے بڑھ کر سچا فلسفۂ عمل اور کیا ہو گا۔ میری نیت بخیر ہے تو اس ادبی معصیت پر کوئی مواخذہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ میری یہ تلخ نوائیاں کسی مخاصمانہ جذبے پر مبنی ہیں۔ یا ان میں کوئی اصلاحی اسپرٹ پوشیدہ ہے۔ کیا آپ کا ضمیر گواہی دے سکے گا کہ میرا دل صنادید پرستی کے جذبے سے خالی ہے۔ کیا مَیں میر تقی میر، میرزا سودا، خواجہ میر درد دہلوی، میر انیس، خواجہ آتش، استاد بحر لکھنوی مولانا اکبر الٰہ آبادی، مولانا شاد عظیم آبادی جیسے بزرگوں کا احترام نہیں کرتا۔ کرتا ہوں، صدق دل سے احترام کرتا ہوں۔ اسی طرح غالب کے کمالات کا بھی معترف ہوں مگر اس حد تک جتنی میرا ضمیر اجازت دیتا ہے۔ مَیں غالب کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ پرائی آنکھ سے دیکھ نہیں سکتا۔ ہر شخص اپنے علم و یقین تک مکلف ہے اور بس۔ "الاعمال بالنیات" تمام اعمال و افعال کا دارومدار نیت پر ہے نیت ہی پر سزا و جزا کا انحصار ہے اس فلسفہ کے تحت اک عجیب و غریب واقعہ یاد آگیا جو حد درجہ دلچسپ ہے۔ خطۂ پاک عظیم آباد میں ایک مشہور و معروف طبیب تھے۔ حکیم کاظم حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ وہ عموماً اُلٹا علاج کیا کرتے تھے۔ دیکھنے والے کہتے تھے مریض کو مار ڈالیں گے مگر ان کی کامیابی پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ وہاں ایک

وکیل تھے غلام قادر نام ۔ ان کا ایک بھائی تھا ۔ جو کسی شادی کی تقریب میں چھ سات دن تک شب و روز جاگتا رہا تھا ۔ تقریب سے فراغت پانے کے بعد وہ ایک ٹھنڈے اور مرطوب تہ خانہ میں جاکر سو رہا ۔ سویا تو دو دن تک شب و روز سوتا ہی رہا ۔ گھر میں ڈھونڈھیا پڑی کہ لڑکا کہاں غائب ہو گیا ۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے پتا لگا تو لوگوں نے اسے جگایا ۔ وہ اُٹھا آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا اور اپنے سر پر ہاتھ رکھا تو ایسا پلپلا معلوم ہوا جیسے گُندھا ہوا آٹا ۔ جس جگہ سر پر اُنگلی رکھتا ہے اس طرح دھنس جاتی ہے جیسے گندھے ہوئے آٹے میں ۔ یہ حال دیکھ کر لوگوں کے ہوش جاتے رہے ۔ بھائی صاحب نے کہا جاؤ جلدی چچا کے پاس (وہی حکیم صاحب) بے چارہ دوڑتا ہوا حکیم صاحب کے پاس پہنچا اور اپنا سارا حال کہہ سُنایا ۔ حکیم صاحب نے سر ٹٹول کر دیکھا اور کہا اچھا بیٹھو ۔ ذرا پان تو بناؤ ۔ وہ پان بنانے لگا اور حکیم صاحب ٹہلنے لگے ۔ کچھ سوچتے جاتے ہیں ۔ سوچتے سوچتے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے ۔ سل کا بٹا پڑا تھا ۔ اُٹھا کر اور لڑکے کی نظر بچا کر زور سے سر پر کھینچ مارا ۔ وہ بے چارا بلبلا گیا ۔ حکیم صاحب تو دیوانے مشہور ہی تھے وہ یہ سمجھا کہ چچا پر جنون سوار ہے ۔ ڈر کے مارے بھاگا ۔ بھاگتا بھاگتا گھر پہنچا اور جو حادثہ غریب پر گزرا تھا بھائی سے بیان کیا ۔ انھیں سخت تعجب ہوا ۔ پوچھا کہ بہت چوٹ تو نہیں آئی ۔ اب اسے اپنا سر یاد آیا ۔ بھاگتے وقت تو اسے سر پاؤں کا کچھ ہوش نہ تھا ۔ اب جو سر کو ٹٹولتا ہے تو اچھا خاصا ہے ، سارا پلپلا پن جاتا رہا ۔ بھائی صاحب نے ٹٹول کر دیکھا تو انھیں بھی حیرت ہوئی کہ ایسا انوکھا علاج کبھی دیکھا نہ سُنا ۔ تھوڑی دیر بعد حکیم صاحب خود مریض کے گھر جا پہنچے کہ دیکھیں کیا حال ہے ۔ دیکھا تو سر ٹھیک تھا ۔ علاج کی کامیابی پر مسکراتے وکیل صاحب نے پوچھا ۔ چچا جان یہ کیسا علاج تھا کہ بٹا کھینچ مارا اور مرض غائب ۔" فرمایا اس لڑکے کے سر میں رطوبت اس غضب کی جمع ہو گئی تھی کہ سر پلپلا ہو گیا ۔ اس رطوبت کو جلد سے جلد

خارج ہونا چاہیے تھا مگر دنیا میں کوئی ایسی دوا نہ تھی کہ اتنی کثیر مقدار میں رطوبت کو خارج کر سکتی جب تک دوا اثر کرتی اس سے پہلے مریض کا سر سڑ گل کے پانی ہو جاتا میں نے تھوڑی دیر جو غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ اگر اچانک اس کے سر کو چوٹ پہنچائی جائے تو بہت ممکن ہے کہ مریض کے نظام جسمانی میں ایکا ایکی ہیجان و انتشار پیدا ہو اور وہ رطوبت جو ایک ہی مقام پر جمع ہے تمام جسم میں منتشر ہو جائے چنانچہ یہی ہوا۔ اچانک چوٹ لگتے ہی رطوبت سارے جسم میں منتشر ہو گئی اور سر کا پلپلا پن جاتا رہا۔ اب اس رطوبت کو جو سارے جسم میں پھیل گئی ہے جلاب سے خارج کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جو اصل علاج تھا وہ ہو گیا۔ دیکھئے کتنا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ علم طب کے اعتبار سے جو نتیجے اس واقعے سے نکلتے ہیں ان سے ہمیں مطلب نہیں حکیم صاحب کی جودت ذہن کا جو ثبوت ملتا ہے اس سے سروکار نہیں۔ یہاں فقط یہ دیکھنا ہے کہ حکیم صاحب نے کس نیت سے بٹا کھینچ مارا۔ علاج کی غرض سے۔ نیت ان کی بخیر تھی۔ انجام بھی بخیر ہوا اور اگر نتیجۂ عمل حسب دلخواہ نہ بھی ہوتا تو بھی ان سے کوئی مواخذہ نہ تھا کیوں کہ ارادہ نیک تھا۔ مجھے بھی اپنے اوپر بھروسا ہے کیوں کہ میری عافیت بخیر ہے۔ غالب پر جو کچھ بوچھاریں ہو رہی ہیں انھیں غالب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بوچھاریں تو فقط اس غرض سے ہیں کہ غلیچیوں کی بہکی ہوئی ذہنیتوں پر چوٹ پڑے دماغوں میں جو مادۂ فاسد جمع ہو گیا ہے خارج ہو جائے اور انشاءاللہ یہ ہو کر رہے گا۔

غالباً اب آپ کو اس امر میں کوئی شبہ باقی نہ رہے گا کہ میری ان تمام تقریروں کا مخاطب غالب نہیں ہو سکتے کیوں کہ گفتگو مُردوں سے نہیں ہوتی زندوں سے ہوتی ہے اس کے علاوہ اس حقیقت پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ میرزا غالب نے خود اپنے پیشرو (مولف برہان قاطع) پر نہایت سخت لب و لہجہ میں تنقید کی ہے جو پایۂ

تہذیب سے گری ہوئی ہے۔ مجھ سے زیادہ غالب پر سخت کلامی یا بداخلاقی کا الزام کھپ سکتا ہے اور سب سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ غالب پرستوں نے تمام اساتذۂ ماضی وحال کا حق تلف کر کے غالب کو دے دیا ہے مگر میں نے ہرگز غالب کا حق تلف نہیں کیا (ان کو اُردو کا مایۂ ناز شاعر مانتا ہوں) ہاں کھری کھری سُنا دی جس کے مخاطب غالب نہیں ہیں بلکہ غالب پرست ہیں۔

غالب شکن کی اشاعت کا ذمّہ دار کون ہے؟ دلّی وال۔ "ترانہ" کی محض چند مزاحیہ رباعیوں سے چراغ پا ہو کر جب دلّی وال نے رسالۂ ساقی دہلی کے اکیس صفحوں پر مہمل خامہ فرسائی کر کے "ترانہ" کو گویا مجموعۂ خرافات باور کرانا چاہا تو مَیں نے کہا جاتا کہاں ہے، اور لیتا جا۔ یہ ہے غالب شکن کی شانِ نزول۔

غالب شکن کی اشاعت اوّلین میں مَیں نے غالب کی شاعرانہ چوریوں کا ثبوت اس لیے پیش نہیں کیا تھا کہ بارہا ادبی رسالوں میں ثبوت پیش کیے جا چکے تھے۔ مگر اب پھر مطالبہ کیا جاتا ہے تو یہ قرض بھی ادا کیے دیتا ہوں۔ لگی کیوں باقی رکھوں۔

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟

غالبؔ اور مسعود حسن رضوی ادیبؔ

مسعود حسن رضوی کو غالب سے خاصا لگاؤ تھا۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے انھوں نے غالب کو پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے کے حالات و واقعات کے بارے میں خود لکھتے ہیں :-

"اسکول میں مولانا سید جواد صاحب اور کالج میں مولانا علی اصغر صاحب یہ دونوں شخصیتیں ایسی ملیں جو میرے لیے ناقابلِ فراموش ہیں۔ دونوں اسلامی علوم کے عالم، عربی کے فاضل اور فارسی کے شاعر تھے۔ دونوں اُردو کے شاعروں میں میر انیس کے عاشق اور مرزا غالب سے بیزار تھے۔ سید جواد صاحب غالب کی فارسی دانی کے قائل تھے مگر غالب کی شاعری پر مضحکہ کرتے تھے۔ غالب کا یہ شعر بڑے مضحک انداز میں پڑھتے تھے۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اِک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

اور ناسخ کے اِس شعر پر وجد کرتے تھے :

ہمارا ہر نفس اِک بادباں ہے
روانہ کشتیِ عُمرِ رواں ہے

ایک دفعہ میں نے غالب کی وہ غزل ان کو سُنائی جس کا مطلع ہے :

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

کسی شعر کی تعریف نہ کی ۔ مگر جب مَیں نے مقطع پڑھا :

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر !

تو بے ساختہ کہہ اُٹھے " ایسا کیوں نہیں کہتا یہ گڑھے کیوں کہتا ہے "۔

مولانا علی اصغر صاحب غالب بیزارگی میں سیّد جواد صاحب سے بھی بہت آگے تھے ؛ ایک مرتبہ مجھ سے پوچھا " اُردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے " مَیں نے عرض کیا کہ کسی ایک شاعر کو ہر حیثیت سے تمام دوسرے شاعروں سے بہتر قرار دینا مشکل ہے ؛ اجازت ہو تو چند شاعروں کے نام لوں ۔ فرمایا اچھا ۔

مَیں نے کہا ، میر ، انیس ، غالب ۔ غالب کا نام سُنتے ہی تند و تلخ لہجے میں بول اُٹھے

" یہ میر اور انیس کے ساتھ غالب کا کیا جوڑ ۔ اس کو نہ اُردو پر عبور نہ فارسی پر ۔ ہزل کی جگہ جد ہے ، جد کی جگہ ہزل ہے ۔ ایک بے امتیاز شخص تھا " ان دونوں فاضل اور شفیق اُستادوں کی صحبت سے کافی فیض پایا ، مگر غالب کے بارے میں ان کا ہم خیال کبھی نہ ہو سکا ؎

اِسی بات کا تذکرہ انھوں نے اپنے مضمون " مرزا غالب تب اور اَب " مشمولہ نگارشاتِ ادیب ، صفحہ ۲۵۸ - ۲۵۹ میں بھی کیا ہے ۔

" امتحانِ وفا " میں مسعود حسن رضوی نے غالبؔ کے کئی شعر استعمال کیے ہیں ۔ مثلاً :

؎ میری زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات و شخصیات ، لکھنؤ ریڈیو ، نشریہ ۲ ستمبر ۱۹۶۰ء

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا،
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر! ص ۲۲

کہتے ہیں ہے مکاں کو مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے[1] ص ۴۲

میں نامراد دِل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ اس کے رُخ سے نگہ کامیاب ہے ص ۴۶

زندگی یُوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذر یاد آیا! ص ۴۸

مسعود حسن رضوی کو غالب فہمی میں کمال حاصل تھا۔ وہ شعر کو پڑھ کر ہی معنی کی تہیں کھول دیتے تھے۔ ڈاکٹر آفاق حسین نے اپنے مضمون[2] میں کئی مثالیں دی ہیں جن سے ان کی غالب کے کلام کی تشریح و توضیح پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔

غالب، مسعود حسن رضوی کا خاص موضوع نہیں تھے۔ بلکہ انھوں نے اس سلسلے میں کئی ایک ضمنی کام کیے ہیں۔ البتہ انھوں نے تمام عمر غالب کا مطالعہ جاری رکھا۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے اپنے ایک مضمون "غالبیات اور مسعود حسن رضوی ادیب" میں تحریر کیا ہے:

"غالب، مسعود کا خصوصی موضوع نہیں تھے، لیکن غالب کے متعلق ان کی

۱۔ یہ شعر اس طرح ہے:

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

۲۔ آج کل نئی دہلی، فروری ۱۹۷۶ء

تحریروں خصوصاً "متفرقات" کی وجہ سے ان کو غالب شناسوں کی صف میں جگہ مل گئی"۔[۱]

" ہماری شاعری" میں میر کے بعد سب سے زیادہ اشعار غالب کے ہیں اور ان کی تعداد ۵۴ کے قریب ہے۔ بہر کیف غالب کے سلسلے میں جو تھوڑا بہت تحقیقی کام مسعود حسن رضوی نے کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے :

(الف) متفرقاتِ غالب

نظم طباطبائی اور تنقیدِ کلامِ غالب۔

(ب) مضامین

(۱) مرزا غالب کا کچھ غیر مطبوعہ کلام اور اس کی شانِ نزول،
الناظر لکھنؤ، دسمبر ۱۹۳۴ء

(۲) مرزا غالب کی ایک ہنگامہ خیز مثنوی،
زمانہ کانپور، مارچ۔ اپریل ۱۹۴۶ء

(۳) غالب کے دو تعزیت نامے اور چیا جان،
ماہِ نو کراچی۔ فروری ۱۹۴۹ء

(۴) غالب کے حالات میں پہلا مضمون،
مشمولہ احوالِ غالب، مرتبہ مختار الدین آرزو

(۵) خطوطِ مشاہیر بنام ولایت دعز یز صفی پوری شاگردِ غالب
مشمولہ عیارِ غالب، مرتبہ مالک رام

۱۔ غالب نامہ، ص ۱۴۷۔

(۶) شرح طباطبائی اور تنقید کلامِ غالب،

فروغ اُردو لکھنؤ، غالب نمبر ۱۹۶۹ء

(۷) فکرِ غالب (غالب کے ایک شعر کی شرح)

ماہنامہ کتاب لکھنؤ، مارچ ۱۹۶۹ء

(۸) مرزا غالب تب اور اب،

ماہنامہ کتاب لکھنؤ، اپریل ۱۹۶۹ء

(۹) غالب کے ایک قصیدے پر واجد علی شاہ کا عطیہ،

ہماری زبان، علی گڑھ ۲۲، ستمبر ۱۹۷۱ء

(۱۰) غالب کا ایک فارسی خط،

تحریک دہلی، مئی ۱۹۶۲ء

(۱۱) غالب کا ایک خط اور غالب کے نام دو خط،

نیا دَور لکھنؤ، جنوری ۱۹۷۴ء

(ج) تبصرے:

۱۔ قتیل اور غالب، از سیّد انور علی آفریدی

۲۔ ذکرِ غالب، از مالک رام

۳۔ لطائفِ غالب، مؤلفہ مسز اے۔ ایم شاہ

مسعود حسن رضوی کی غالب سے عقیدت کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ یاس یگانہ چنگیزی، غالب کے سخت مخالف تھے اور وہ مسعود حسن رضوی کو غالب کے طرفداروں میں شامل کرتے تھے۔ یگانہ کی کتاب "غالب شکن" میں مسعود حسن رضوی کے نام ایک طویل خط ہے جو انھوں نے مسعود حسن رضوی کے خط کے جواب میں لکھا ہے۔ مسعود حسن رضوی والا خط نہیں مل سکا، مگر قیاس یہ ہے کہ اس خط میں مسعود حسن رضوی نے

یگانہ کو سمجھایا ہوگا کہ غالب دشمنی ان کے حق میں مضر ثابت ہو رہی ہے۔ اِس خط کی مسعود حسن رضوی کی غالب سے دلچسپی کے سلسلے میں خاصی اہمیت ہے۔

ذیل میں غالب پر مسعود حسن رضوی کے کام کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

متفرقاتِ غالب :

متفرقاتِ غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں رامپور سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں کتاب نگر لکھنؤ نے شائع کیا۔ اس میں ۲۲ صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ بھی شامل ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں چند نئی چیزوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول مکتوبات اور حصہ دوم منظومات پر مشتمل ہے۔ یہ تمام چیزیں غیر مطبوعہ نہیں ہیں لیکن جن رسائل میں یہ شائع ہوئی ہیں وہ بھی بہت سے لوگوں سے اوجھل رہے۔ ان میں مثنوی "بادِ مخالف" قابلِ ذکر ہے۔ اِس سلسلے میں اگر حواشی میں اختلافات کی نشاندہی ہوجاتی تو یہ بہتر صورت میں سامنے آجاتی۔ بہرحال اِس کتاب کے حوالے سے غالب اور ان کے متعلق جو چیزیں سامنے آئی ہیں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ مسعود حسن رضوی کے دو مضامین "مرزا غالب کا کچھ غیر مطبوعہ کلام اور اس کی شانِ نزول" اور "مرزا غالب کی ایک ہنگامہ خیز مثنوی" جو نگارشاتِ ادیب میں بھی شامل ہیں، انھیں متفرقاتِ غالب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مقدمے میں اِن تحریروں کی اہمیت اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اُن منابع اور ماخذات کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے جہاں سے یہ تحریریں لی گئی ہیں۔ اِس سلسلے میں مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں:

> "میرے کُتب خانے میں ایک بیاض ہے جس میں مرزا غالب کے اٹھائیس فارسی خط، دو فارسی قطعے، ایک فارسی مثنوی اور ایک اُردو غزل بھی شامل ہے۔ یہ کُل خط ایسے لوگوں کے نام ہیں جو کلکتے میں مقیم تھے اور

یہ سب نظمیں ایسی ہیں جو غالب نے کلکتے کے قیام کے زمانے میں کہی تھیں
اِس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کسی کلکتے کے رہنے والے ہی نے یہ تمام
چیزیں اس بیاض میں جمع کی ہیں۔ [۱]

مقدمے میں متعلقہ افراد کے حالات اور خطوط کی وجوہات بھی نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں اور اختلافات کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے ۔ اس حوالے سے غالب کے سلسلے میں مسعود حسن رضوی نے جو نئی چیزیں پیش کی ہیں، ان کی روشنی میں ان کا نام بھی غالب کے محققوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے ۔

شرحِ طباطبائی اور تنقیدِ کلامِ غالب :

یہ کتاب ۱۹۷۳ء میں کتاب نگر لکھنؤ نے شائع کی ۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں :-

"مسعود حسن رضوی کی قلمی یادداشتوں میں ایک پُرانی یادداشت ہے جس میں کچھ تنقیدی نکات درج کرنے کے بعد لکھا گیا ہے کہ مندرجہ بالا خیالات طباطبائی نے شرح دیوانِ غالب میں ظاہر کیے ہیں۔ یہ یادداشت بظاہر "ہماری شاعری" کی تصنیف کے زمانے کی ہے۔ ایک مدّت کے بعد جب غالب صدی کے موقعے پر ماہنامہ "اُردو" لکھنؤ نے اپنے غالب نمبر کے لیے مسعود سے کوئی مضمون مانگا تو انھوں نے شرح طباطبائی کے وہ بیانات بھی مرتب کر لیے تھے جن میں کلامِ غالب کے معائب ظاہر کیے گئے ہیں۔ لیکن غالب صدی کے موقع پر ان کی اشاعت کو مناسب نہیں سمجھا ۔ چند سال گزر جانے کے بعد انھوں نے دونوں طرح کے بیانات کو جمع کر کے

۱۔ متفرقاتِ غالب (دوسرا ایڈیشن)، ص ۸ ۔

کتابی صورت میں شائع کر دیا۔"۱

کتاب میں ایک مختصر پیش نامہ بھی ہے جس میں مسعود حسن رضوی نے اِس کتاب کی غرض و غایت بھی بیان کر دی ہے لکھتے ہیں :

"غالب کے اُردو دیوان کی بہت سی شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ اِن میں مولانا سید علی حیدر نظم طباطبائی کی شرح کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ مولانا ایک مسلّم الثبوت عالم، شاعر اور ناقد تھے۔ وہ دیوانِ غالب کی شرح میں کلامِ غالب کی تشریح و تفہیم کے ساتھ ساتھ تنقید بھی کرتے گئے ہیں۔ ان کے مختصر لیکن نہایت اہم تنقیدی بیانات شرح کے ساڑھے تین سو صفحوں میں بکھرے ہوئے ہیں جن میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں ہے۔ راقم نے ان کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر ان منتشر بیانات کو محاسنِ کلام اور معائبِ کلام کے دو بابوں میں مناسب عنوانوں کے تحت جمع کر دیا ہے۔"۲

مسعود حسن رضوی نے انھیں صرف مناسب ترتیب سے جمع کر دیا ہے اگر وہ اس تنقید پر مزید تنقید لکھتے تو اس سے غالب فہمی کے نئے در کھل جاتے اور اس طرح اس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی۔ بہر طور اس طرح غالب پر کام کرنے والوں کے لیے آسانی پیدا ہو گئی ہے۔

متفرق مضامین :

ان مضامین میں، جن کی فہرست اوپر کے صفحات میں پہلے ہی دی جا چکی ہے،

۱۔ غالب نامہ۔ ص ۱۵۴۔

۲۔ نظم طباطبائی اور تنقیدِ کلامِ غالب، ص ۳۔

اکثر مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ غالب کے حالات میں پہلا مضمون تحقیقی ہے، جس میں محمد حسین آزاد کا کہا ہوا قطعہ تاریخِ وفات غالب بھی شامل ہے۔ "غالب کے دو تعزیت نامے اور چنیا جان" کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ اس سے حاتم علی بیگ مہر کی محبوبہ چنیا جان کے بارے میں معلومات ملتی ہیں اور بعض خفیہ گوشوں سے پردہ اُٹھتا ہے۔ اسی طرح "غالب کے ایک قصیدے پر واجد علی شاہ کا عطیہ"، "غالب کا ایک فارسی خط" اور "غالب کا ایک خط اور غالب کے نام دو خط" تحقیقی نوعیت ہی کے ہیں۔

مسعود حسن رضوی نے یگانہ کو جو خط لکھا تھا اور تلاش بسیار کے بعد اس کا متن نہیں مل سکا اس میں بھی ان کی غالب سے دلچسپی کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ اگر یہ خط مل جاتا تو یگانہ کے خط سے تقابلی مطالعے سے ایک نئی صورت سامنے آجاتی۔ مسعود حسن رضوی یگانہ کے اس خط کا جو غالب شکن میں شامل ہے، اپنے ایک مضمون "مرزا غالب تب اور اَب" میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "اس موقع[1] پر میرے مرحوم دوست مرزا یگانہ چنگیزی کی تصویر میری نظروں میں پھر رہی ہے۔ مرحوم نے اپنی کتاب میں غالب پر سخت ترین اعتراض کیے ہیں، جو پہلے "غالب شکن" کے نام سے اور پھر بہت سے اضافوں کے ساتھ "غالب شکن دو آتشہ" کے نام سے شائع ہوئی۔ مصنف کے تیور کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہیں۔ یہ کتاب اصل میں ایک طویل خط ہے جو مرزا یگانہ نے میرے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا۔ یگانہ مرحوم غالب کی مخالفت میں بہت بدنام ہوتے۔ لیکن وہ ذاتی طور پر

۱۔ اس سے مُراد غالب صدی تقریبات ہیں۔

خود کو غالب کا مخالف نہیں "غلبیوں" کا مخالف کہتے تھے۔ ان کی مخالفانہ تحریروں کا مقصد خود ان کے قول کے موافق یہ تھا کہ غالب کے ان پرستاروں کو سبق دیا جائے جو غالب کو صحیح طور پر سمجھے بغیر ان سے اندھی عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام اور کردار کو ہر طرح کے عیوب سے مبرا سمجھتے ہیں اور ان کے سوا کسی دوسرے شاعر کے کمال کے قائل نہیں۔"[۲]

اس تناظر میں اگر غالب کے سلسلے میں مسعود حسن رضوی کے کام کا جائزہ لیں تو اگرچہ اس کی مقدار کم ہے مگر معیار میں کہیں اونچا ہے۔ اگر مسعود حسن رضوی مستقل طور پر غالب کو بھی اپنا موضوع بناتے تو غالب کے بارے میں نئی باتیں سامنے آتیں، مگر وہ تحقیقی کاموں میں الجھے رہنے کی بنا پر اس طرف توجہ نہ کر سکے۔ اس پر خود حسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جی تو میرا بھی چاہتا تھا کہ اپنی زبان کے اس مایۂ ناز شاعر کے شایانِ شان کچھ لکھوں لیکن اس شاعر کا یہ شعر اب میرے حسبِ حال ہے:

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے"[۳]

مسعود حسن رضوی نے غالب کے سلسلے میں جو تھوڑا بہت کام کیا ہے اس کی بدولت غالبیات میں اُن کا نام ہمیشہ رہے گا۔

۲۔ نگارشاتِ ادیب، ص ۲۶۰۔

۳۔ نگارشاتِ ادیب، ص ۲۶۱۔

غالب کے حالات میں پہلا مضمون

مُنشی بالگوبند ماتھر نے آگرہ سے ایک ماہوار رسالہ " ذخیرۂ بالگوبند" کے نام سے ۱۸۶۸ء کی ابتداء میں جاری کیا۔ مُنشی صاحب دہلی گزٹ پریس، آگرہ کے دفتر میں کلرک تھے۔ خود اُن کا بھی ایک مطبع تھا، آگرہ اُردو اخبار پریس اور اس کے مہتمم، پرنٹر اور پبلشر وہ خود ہی تھے۔ یہ مطبع آگرہ کے محلے پیپل منڈی میں واقع تھا۔ " ذخیرۂ بالگوبند" اسی مطبع میں بہت بڑی تقطیع کے ۴۰ صفحوں میں چھپتا تھا۔ اس کا چندہ سالانہ چھ روپے اور محصول ڈاک بارہ آنے تھا۔ اس رسالے کے تینتیس ۳۳ پرچے میرے کُتب خانے میں موجود ہیں۔ ان میں سے پہلا پرچہ مارچ ۱۸۶۸ء کا اور آخری دسمبر ۱۸۷۰ء کا ہے۔ رسالے کے مضامین کی نوعیت کا اندازہ سرورق کی حسب ذیل عبارت سے کیا جاسکتا ہے:۔

" ذخیرۂ بالگوبند مشتمل بر جمیع علوم و فنون و تحقیقات ہر قسم و رائے و تقاریر و معرفت الٰہی و عجائباتِ روزگار و حالاتِ دلچسپ و قصصِ رنگین و لطائف و ظرافت و مراسلات و غزلیات شعرائے حال مع نقشہ جات و تصاویر۔"

اِس رسالے کے مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں مرزا غالبؔ کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا۔ جس کا عنوان ہے " مرزا اسد اللہ خاں متوفّی المتخلص بہ غالب و نوشہ"۔ غالب کی وفات ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو واقع ہوئی۔ اِس سانحے کے صرف چند روز بعد یہ مضمون لکھا گیا اور غالباً مرزا غالبؔ کے حالات میں یہ پہلا مضمون تھا جو کسی رسالے میں شائع ہوا۔

اس مضمون سے غالب کے متعلق ہماری معلومات میں کچھ اضافہ بھی ہوتا ہے اِس لیے اب کچھ اوپر بیاسی برس کے بعد یہ پھر شائع کیا جارہا ہے۔

(۲۵ فروری ۱۹۵۱ء)

مرزا اسداللہ خاں متوفی المتخلص بہ غالبؔ و نوشہ

یہ شخص شہر دہلی میں ایک بڑا نامی گرامی شاعر فارسی کا تھا۔ اگرچہ اشعار اُردو بھی اُس کے بہت ہیں مگر زیادہ تر شہرت فارسی میں حاصل تھی۔ ممالک مغربی و شمالی ہند کے پڑھے لکھوں میں کم شخص ہوں گے جنھوں نے اس کے شعر اُردو فارسی پڑھے یا سُنے نہ ہوں گے۔ کلام میں تخلص اپنا اُس نے کہیں غالب اور کہیں نوشہ لکھا ہے۔ اگرچہ نام اسداللہ خاں تھا مگر دہلی اور دیگر اضلاع میں عموماً لوگ مرزا نوشہ کہا کرتے تھے۔

اُس کی تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ سلسلہ اُس کے خاندان کا افراسیاب بادشاہ ترکستان سے مسلسل تھا۔ ابتدا میں اس نے اور اس کے بزرگوں نے جو دولت، ملکیت اور اختیارات پاتے بہ فن سپہ گری و جوہر شمشیر پاتے۔ علم فارسی اُس نے بامید روزگار تحصیل نہیں کیا تھا، اپنے دلی ذوق سے سیکھا تھا۔ موزونی طبع کے باعث طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ علاوہ ناظم ہونے کے ناثر بھی تھا۔ نثر میں سات کتابیں اُس کی تصنیف و تالیف کی ہوتیں زیادہ معروف ہیں اور بہت سی چھپ بھی گئی ہیں۔ نام اور مطالب اُن کے یہ ہیں یعنی۔

۱۔ **دیوان فارسی** : اس میں تخمیناً دس ہزار شعر ہیں۔

۲۔ **دیوان ریختہ** : یہ دیوان اُردو، نہایت مختصر ہے۔

۳۔ **مہر نیمروز** : یہ تاریخ خاندان تیموریہ کی نثر میں ابتدائے زمانہ ہمایوں شاہ سے تا بہ عہد بہادر شاہ خارج شدہ بادشاہ دہلی متخلص ظفر ہے۔

۴۔ **دستنبو** : اس میں ایامِ غدر ۱۸۵۷ء کی تباہی اور بربادی اپنی کا حال نثر میں قلم بند کیا ہے اور عبارت میں کوئی لفظ عربی کا نہیں لایا ہے۔

۵۔ **پنج آہنگ** : اس کتاب میں اپنے خطوط، دیباچے، خاتمے کتب کے، اصطلاحی محاورے، قواعد فارسی، الفاظ اور مصادر درج کیے ہیں۔

۶۔ **اردوئے معلیٰ** : اس صحیفے میں اکمل المطابع واقع دہلی کے مہتمم نے اُردو، زبان کے رقعات اُن کے جمع کر کے یہ نام رکھا ہے اور انھیں کے یہاں شاید چھپ بھی رہے ہیں۔

۷۔ **قاطع برہان** : یہ تبدیلِ نام درفش کاویانی۔ اس میں برہان قاطع مشہور کتاب لغت کے مولف کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ لکھا ہے کہ سوائے ان کتابوں کے اور بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور رسالے اُس کے موجود ہیں مگر اس قدر مشہور نہیں ہیں اور نہ ہنوز معرضِ طبع میں آتے ہیں۔

ایک عرصہ ہُوا جب یہ نامی شاعر زیورِ اسلام اُتار کر حلیہ فریمیسن سے آراستہ ہوا تھا۔ ہرچند اُس کے احباب نے حال اِس مذہب نَو اختیار کا اور کیفیت فریمیسن ہوس کی دھوکا دے دے کر بھی دریافت کی پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔ یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو (یہ کرامت اور وصف اس مذہب کا خاص مشہور ہے) مے پرستی کا ایامِ شباب سے تا بہ عالمِ پیری شوق تھا۔ جس وقت عالم سرد اور دن ابر کا ہوتا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہوتی، روشِ باغ میں سیرِ چمن و گلگشت گلشن کرتا ہوتا تھا، اُس وقت طبیعت، درختہائے دلکش و گلہائے رنگیں کو خیابانوں میں تراوت بخش دُلہا دیکھ کر لہرایا کرتی تھی۔ بعد وفات مرزا ذوق، نامی گرامی شاعر اُردو، ملک الشعرا، خطاب، اُستاد بہادر شاہ کے یہی موردِ عنایاتِ سلطانی رہا کرتا تھا اور غزل بھی اُس کی دیکھا کرتا تھا۔

اخیر میں اِن دنوں کہ زمانے میں طفیل سرکار دولتمدار انگلشیہ کے علم وہنر کی ترقی اور رواج بہت ہے تو اکثروں نے واقف ہو کر اُن کے نظم ونثر کلاموں پر بہتیرے اعتراض کیے۔ اور وہ اخباروں میں شائع ہوتے تھے۔ جوابات بھی اُن کے اسداللہ خاں کی طرف سے اکثر درج کیے جاتے تھے۔ بہت سے قیل وقال ہوتے تھے۔ اُن میں بڑا عذر اس شخص کا یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ میں نہایت ضعیف ہو گیا ہوں، حواس باختہ اور خاطر پریشان رہتی ہے، بدن میں ضعفِ قلبی غالب ہے، سماعت سے عاری ہوں ہاتھ پاؤں کام کم کرتے ہیں، آدمی کی صورت نہیں پہچانتا، آواز کم سُنائی دیتی ہے، جو کوئی بروقت ملاقات بات کیا چاہتا ہے لکھ کر دیتا ہے اور اس کا جواب تحریری لیتا ہے، کاغذ قلم دوات چاقو، قلمدان بستہ ہر وقت پیشِ نظر رہتے ہیں، خورد ونوش کے ہضم کی قوت نہیں، زندگی کا لُطف نہ رہا، موت نزدیک معلوم ہوتی ہے، اگر چند روز مر مر کے جیے تو کیا جیے، اب قابلِ معافی ہیں۔ اور واقع میں یہ جواب اُس کا معقول تھا کہتے ہیں کہ آدمی اچھا، خوش مزاج، یارباش، خوش وضع، خوش انداز، جلیل القدر، حسب ونسب میں اعلیٰ، ملکوں میں نامور اور شاعر اور منشی قابلِ تعریف تھا۔ دم اُس کا بھی غنیمت تھا۔ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہُوا اور ۱۲۸۵ھ میں ۷۳ برس کی عمر پا کر روضۂ رضواں میں جا گزیں ہُوا۔ جس نے سُنا اُس کے مرنے کا افسوس کیا۔ لیکن جب تک اُس کا کلام، جو اُس نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے، روئے زمین پر قائم رہے گا، وہ زندہ تصوّر کیا جائے گا اور نام اُس کا یادگار رہے گا۔ اب ہماری بھی یہی دُعا ہے کہ غفور الرحیم اُس کی مغفرت کرے۔

شاگردوں نے جو تاریخیں اُس کے وفات کی نکالی ہیں اُن میں سے ایک تاریخ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

قطعۂ تاریخ

طبعزاد مولوی محمد حسین صاحب آزاد شاگرد رشید محمد ابراہیم خاں ذوق دہلی

بلبلِ باغ پہلوی و دری
اسد اللہ غالب و نوشہ

فکر تش جاں نواز و جانش پاک
نفسش روشن و دلش آگہ

سخنش کانِ گوہرِ افکار
نظم و نثرش تمام نقد سرہ

غالب آن شیر بیشۂ معنی ،
صید مضموں شکار او چو برہ

بہ ظہورش خفا ظہوری را ،
اسدی در مقابلش روبہ

عنصری پیش دست بے جوہر
عسجدی بردہ بردرش سجدہ

بعردسی بکرہائے سخن ،
فی المثل پیر زاہدے نوشہ

رخت بربست چوں ز دار محن
نظم مضموں شد ست آوارہ

جگرِ بحر آب شد بہ غمش ،
دل تقطیع گشت صد پارہ

از پے سال رحلتش آزاد
ہاتفِ غیب گفت وزد نعرہ

شدہ مغفور از خدائے غفور
کہ بود سالِ فوتِ او "غفرہ"

۱۲۸۵ھ

مرزا غالب کا کچھ غیر مطبوعہ کلام اور اُس کی شانِ نزول

میرے کُتب خانے میں ایک قلمی بیاض ہے جس میں منجملہ اور چیزوں کے مرزا غالب دہلوی کے کوئی پچاس خط اور چند نظمیں ہیں۔ یہ خط اور نظمیں زیادہ تر غیر مطبوعہ ہیں۔ اور وہی اس مضمون کا ماخذ ہیں۔ (ادیب)

جس زمانے میں مرزا غالب دہلوی کلکتہ میں مقیم تھے تو قدرتاً وہاں کے سخن سنج اور سخن فہم حضرات سے رسم و راہ ہو گئی تھی۔ مرزا کے ان کلکتوی دوستوں میں مرزا ابوالقاسم خاں قاسم اور مرزا احمد بیگ خاں طپاںؔ[1] بھی تھے۔ غالب ان دونوں کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے اور اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ ذیل میں مرزا غالب کے خطوں کے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جن سے اِن تینوں صاحبوں کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

اقتباسات متعلق مرزا ابوالقاسم خاں

(۱) کلکتہ کے قیام کے زمانے میں لکھتے ہیں :-

"قبلۂ من اگرچہ استدعاے قدوم از بزرگاں بے ادبی است اما می بینم

---

[1] مرزا احمد بیگ خاں طپاں اور اُن کے اُستاد مرزا جان طپش اپنے تخلص حرف طؔ سے لکھتے تھے۔

کہ خورشید بر خرابہ می تابد دست ندارد ابر بر خس و خارمی بارد و ننگ خود نمی شمار د بدیں پیشگری با ہوس کردہ می آید کہ مرزا یک دہ ساعت از روز باقی ماندہ بہ خشکدۂ راقم نزول اجلال فرمایند و مرزا صاحب[1] را باخود آرند"

(۲) کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے مرشد آباد سے لکھتے ہیں:

"انداز غمخواری کہ از علاؤ زمان جناب در حق خویش دیدہ ام زچندانست کہ اندکے از بسیار آں شرح توانم داد بخدا بہ پیشگری اخلاص شما داغِ فراق دہلی بر دلم سرد بود، شکر است و صد ہزار شکر کہ در غربت یک گرانمایہ از ارباب وطن یافتم اما حیف کہ دیگر امید وصال نیست جناب مرزا صاحب[2] وعدہ دادند کہ بہ دہلی خواہم رسید باشد کہ اتفاق افتد۔ لیکن دستم بدامن شما دگر نخواہم رسید۔ آہ از من و داے بروزگار من۔ امروز کہ روز سہ شنبہ است در مرشد آباد م کشتی می جویم۔ امید کہ ہمیں یک دو روز براہ دریا رواں گردم۔"

---

[1] مرزا صاحب سے یہاں مرزا احمد بیگ خاں مراد ہیں۔

[2] ایضاً

"طپاں تخلص مرزا احمد بیگ خاں مرحوم ولد نواب عطاء اللہ خاں باشندۂ دہلی مقیم کلکتہ مختار صدر دیوان کلکتہ شاگرد مرزا جان طپش اولاد میں تغتمش خان والی دشت قبچاق کے تھے۔ دیوان اُن کا نظر سے گزرا۔ ۱۲۳۳ھ میں فوت کی۔ مرزا احمد بیگ اپنا تخلص حرف طاؤ مہملہ سے لکھتے تھے۔" طپش خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ اپنا تخلص طاؤ مہملہ سے لکھتے تھے۔ سخن شعرا ص ۳۰۲۔

"قاسم تخلص، نام ابوالقاسم خان، خاندان بادشاہی سے کچھ قرابت رکھتے ہیں اور اس خاکسار کو بھی ان کی خدمت میں نیاز ہے۔ بالفعل کلکتہ میں تشریف رکھتے ہیں۔" دیوان جہاں قلمی؟ "قاسم تخلص شہزادہ ابوالقاسم اولاد میں امیر تیمور کی تھے۔ کلکتے میں بھی آئے تھے۔" (سخن شعرا ص ۳۷۸)

(۳) کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے باندا سے لکھتے ہیں :-

"با ملازمان سامی دعوے مہر و محبت بے ادبی است۔ من و خدائے من کہ شما در کلکتہ غم غریبی و اندوہ بیکسی از دلم ربودہ بود۔ میدانستم کہ کلکتہ دہلی است۔ وطن بزرگ سپید۔ مربی جاں و تنید۔ بالجملہ روز آدینہ کہ غرۂ جمادی نخست بود بہ باندا رسیدم : روز شنبہ ازیں جائیگاہ رواں خواہم شد۔"

(۴) دہلی پہنچ کر پہلے خط میں لکھتے ہیں :-

"باللہ و اللہ ثم تاللہ کہ رسیدن بہ دہلی[1] ہرگز تلافی اندوہ ہجرانِ کلکتہ نہ کرد تا بہ شادی چہ رسد بکمال تباہی گرفتارم کہ ہر کہ از اہل نظر مرا بیند نداند کہ ایں رہرو منزل رسیدہ است بلکہ پندارد وردمندیست تازہ از وطن بغربت افتادہ آرے چنیں دلجوی نہ چناں بناشد کیسکہ مولوی سراج الدین احمد و مرزا احمد بیگ خاں و مرزا ابو القاسم خاں را از کف دادہ باشد وائے بر من ورد نگار من برگشتہ و نام مہر و وفا در نہاد یاراں نماندہ۔"

(۵) دہلی میں کچھ مدت قیام کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

"قبلہ من بحیرتم کہ کدام جرم سترگ از من بوجود آمد کہ سزاوار اینہمہ عقوبت گردیدم۔ جناب سامی خود گاہے بنامہ یاد نفرمودہ اند و جواب نیاز نامہائے من نفرستادہ۔ مرزا احمد بیگ خاں را چہ شد کہ سہ ماہ گزشت و مکتوبے ازاں جانب نظارہ افروز نگشت۔ من بدہلی بروز سیاہے کہ دشمن نیز مبیناد درماندہ و مہربانانِ کلکتہ یکقلم رُخِ التفات از من گردانندہ۔"

ب۔ "حال جامہ گزاشتن کرنیل املاک صاحب پیش از ورود گرامی نامہ بزبان

---

[1] اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب یکم جمادی الثانی روز یکشنبہ کو کلکتہ سے دہلی پہنچے۔

یکے از صاحبان والا شان شنودہ ام دبرائے مخدومی مرزا ابوالقاسم خاں صاحب، شفقتی آقا محمد حسین[1] صاحب سخت غمیں بودہ ام خدا کند در وصیت نامہ امرے مندرج باشد کہ برائے ایں صاحبان کفایت کند۔"

(ہشتم شوال روز جمعہ کو یہ خط لکھا گیا)

اقتباسات متعلق مرزا احمد بیگ خاں طپاں

(۱) "کتبۂ من فرمان شما بر جان و دلم روانست ہر چہ کو تید بسر شتابم: بفرق پویم اما از شیوہ ہائے مردم دہلی آگہ نیستید چند آنکہ جہد در ادراک حالات میکنم مردم از من می رمند ایک از شما بدگماں می شوند۔"

(۲) "بخدا از رسیدن نامۂ مرزا احمد بیگ خاں برنج اندرم۔ مہربانی را چہ شد و دوستی کجا رفت۔ ایدوں کہ صریح دانستم کہ مرزا صاحب بپاس ربط فلاں[2] بیگ طریقہ فرستادن نامہ و پیام با من مسدود کردند من نیز خود را از تحریر مکاتبات بر کنارہ کشیدہ ام۔"

(۳) "داغ گرمی ایں اتفاق ام کہ احباب کلکتہ مثل نواب علی اکبر خاں و مولوی ولایت حسین ورائے رتن سنگھ سیا جناب مرزا احمد بیگ خاں از دوما، سطرے بنام من ننوشتہ اند۔ حالیا چکنم و قطع نظر از اعانت خبر از کہ جویم و چگونہ دریابم کہ حال آں ناحیہ چیست۔"

(یہ خط غالباً مولوی سراج الدین احمد کو لکھا گیا)

---

[1] بعض خطوں میں اِن کا "آغا محمد حسین" لکھا گیا ہے۔ سیاق عبارات سے مترشح ہوتا ہے کہ محمد حسین مرزا ابوالقاسم خاں کے بیٹے تھے۔

[2] یہ صاحب پنشن کے مقدمے میں مرزا غالب کے مد مقابل تھے۔

(۴) "آنچہ از جانب قبلہ وکعبہ مرزا احمد بیگ صاحب مرقوم بود آویزۂ گوش ہوش گردید ۔ ۔ ۔ ۔ من بے تصنع و بے تکلّف مرزا احمد بیگ خاں را مثل نصر اللہ بیگ، خاں[1] از آبائے خود می شمارم و ہرگز پیش میرزا در میانۂ خود وحامد علی[2] فرق نمی کنم ۔ ۔ ۔ ۔ حال من سراسر بخدمت مرزا صاحب گزارده عرض می تواں کرد کہ واللہ شمار اعم حقیقی و بزرگ معنوی خویشتن می دانم"

(۵) "انصاف بالائے طاعت مرزا احمد بیگ خاں عالم مہر و جہان وفابند۔ دو سہ ماہ از حال من چشم پوشیده بودند وساز تحریر دست باز کشیده۔ ہفتہ می گزرد کہ دو تا نامہ از آنجناب رسید۔ عذر کوتہ قلمیہا خواستہ بودند و عالہا بتحریر در آورده ۔ ازیں سو نیز پاسخہا رواں شد"

دکری صاحب کانپور کے رہنے والے ہیں ان کا خط غالب کو ۱۰ شوال مطابق ۱۱ اپریل روز یکشنبہ کو وصول ہوا ۔ اس کے جواب میں سے یہ اقتباس لیا گیا ہے) خط نمبر ۱۸

بنام سراج الدین ۔

(۶) "والا نامہ رسید و خبر فراق دائمی مرزا احمد رسانید۔ سبحان اللہ چہ مایہ سنگیں دل و سخت جانم کہ نامہ در تعزیت مرزا احمد انشا می کنم و اجزائے وجودم از ہم نمی ریزد۔ می گفت کہ بدہلی می آیم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وعدہ فراموش، بے مروت، راہ گرداند و ناقہ بسر منزل دیگر راند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وائے بے یاری یاران وے، دریغا بے پدری پسران وے ۔ ۔ ۔ ۔ واللہ کہ غمخواری بازماندگان احمد بیگ خاں عین فرض و فرض عین است ہم بر شما وہم بر مرزا ابو القاسم خاں ۔ ۔ ۔ ۔ بہ سامی خدمت مرزا ابو القاسم صاحب

---

[1] مرزا غالب کے چچا کا نام ہے جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے۔

[2] مرزا احمد بیگ خاں کے بڑے بیٹے:

سلامے کہ غدیدہ بر غدیدہ رساند و پیامے کہ ماتم زدہ بہ ماتم زدہ فرستد می
تواں رسانید۔"

خط نمبر ۱۰ بنام سراج الدین (یہ طولانی خط ۱۵ مارچ روز پنجشنبہ کو لکھا گیا)

(۷) "جان من فدائے شما۔ آں میخواہم کہ حال حامد علی خاں و دیگر فرزندان مرزا احمد بیگ خاں مغفور رقم کنید۔ حامد علی خاں نامہ بمن فرستادہ است کہ جز نالہ و فریاد ہیچگونہ حال خود و والدۂ خود ننگاشتہ۔ و طرفہ ایں کہ مرا "بخان صاحب مخدوم و مظہر اشفاق" یاد آوردہ و القابے کہ مرزائی نگاشت بتحریر درآوردہ ہیہات ہیہات۔" عرفی چہ نشستہ کہ یاراں رفتند "سبحان عزیزت کہ دنیا بسرد لم سرد و دلم فقر و سیاحت گرم گشتہ است۔"

اپنے اِن دونوں دوستوں کی تعریف میں غالبؔ نے ایک اُردو غزل کہی تھی جو اُن کی قادر الکلامی پر ایک اور شاہد ہے۔ یہ غزل نہ غالبؔ کے مطبوعہ دیوان میں شامل ہے نہ اب تک کہیں اور شائع ہوتی ہے۔ اِس لیے ذیل میں تمام و کمال نقل کی جاتی ہے:۔

"غزل اسد اللہ خاں غالبؔ در توصیف مرزا احمد بیگ خاں طپاں و مرزا ابوالقاسم خاں"

۱۔ دیکھنے میں ہیں گرچہ دو پر ہیں یہ دونوں یار ایک ۔۔۔ وضع میں گو ہوتی دو سر تیغ ہے ذوالفقار ایک
۲۔ ہم سخن اور ہم زباں حضرتِ قاسم و طپاں ۔۔۔ ایک طپش کا جانشیں درد کا یادگار ایک
۳۔ نقدِ سخن کے واسطے ایک عیارِ آگہی ۔۔۔ شعر کے فن کے واسطے مایۂ اعتبار ایک
۴۔ ایک وفا و مہر میں تازگیِ بساطِ دہر ۔۔۔ لطف و کرم کے باب میں زینتِ روزگار ایک
۵۔ گلکدۂ تلاش کو ایک ہے رنگ ایک بو ۔۔۔ ریختہ کے قماش کو پود ہے ایک تار ایک
۶۔ مملکتِ کمال میں ایک امیرِ نامور ۔۔۔ عرصۂ قیل و قال میں خسروِ نامدار ایک
۷۔ گلشنِ اتفاق میں ایک بہارِ بے خزاں ۔۔۔ میکدۂ وفاق میں بادۂ بے خمار ایک
۸۔ زندۂ شوقِ شعر کو ایک چراغِ انجمن ۔۔۔ کُشتۂ ذوقِ شعر کو شمعِ سرِ مزار ایک

۹۔ دونوں کے دل حق آشنا دونوں رسول پر فدا ایک محبِ چار یار عاشقِ ہشت و چار ایک
۱۰۔ جانِ وفا پرست کو ایک شمیمِ نوبہار فرقِ ستیزہ مست کو ابرِ تگرگ بار ایک
لایا ہے کہہ کے یہ غزل شائبۂ ریا سے دُور
کر کے دل و زبان کو غالبِ خاکسار ایک

اس غزل کے دوسرے شعر میں غالب نے لکھا ہے کہ قاسم اور طپاں میں ایک طپش کا جانشین" اور ایک" درد کا یادگار" تھا۔ طپاں اور طپش کے تخلصوں کی مناسبت سے ظاہر ہے کہ طپش کے جانشین طپاں ہی ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض تذکروں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا احمد بیگ خاں طپاں مرزا جان طپش کے شاگرد تھے۔ تذکرۂ شمیمِ سخن میں یہ بھی لکھا ہے کہ طپاں دہلی کے رہنے والے اور کلکتہ میں عدالتِ صدر دیوانی میں مختار تھے۔ معلوم نہیں کہ مرزا ابوالقاسم خاں کو" درد کا یادگار" کہنے سے غالب کی کیا مراد تھی۔ قاسم خواجہ میر درد کی اولاد میں تھے یا اُن کی شاعری کا سلسلہ درد تک پہنچتا تھا۔

غزل کا نواں شعر بتاتا ہے کہ قاسم اور طپاں میں ایک صاحب شیعہ اور ایک سُنّی تھے۔ ذیل کے تین اقتباسات جو مرزا ابوالقاسم خاں سے تعلق رکھتے ہیں اُن سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قاسم شیعہ تھے اور اگر یہ قیاس صحیح ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طپاں سُنّی تھے۔ غالب مرزا ابوالقاسم خاں کو لکھتے ہیں:۔

(۱) " جناب را بسید الشہدا علیہ السلام سوگند کہ آنرا بکس نہ نمایند۔"

(۲) " شاد و خرم بزی کہ در دو جہاں دستگیر تو سید الشہدا است

(۳) " دیر و زتبرکے کہ فرستادہ بود ند رسید و در دو عالم سرفراز گردانید۔ صاحبِ نذر تا زمانِ ظہورِ خویشتن سلامت دارد و براعلیٰ مراتبِ صورت و معنی رساند۔"

آخری اقتباس میں قرینہ کہتا ہے کہ" صاحبِ نذر سے امام مہدی آخر الزماں مُراد

انھیں مرزا ابوالقاسم خاں کو ایک مرتبہ مرزا غالب نے مسہل لینے کا مشورہ دیا جس سے انھیں فائدہ پہنچا۔ چنانچہ اس کے شکریہ میں انھوں نے ذیل کا قطعہ کہہ کر غالب کو بھیجا۔

"قطعہ ابوالقاسم خاں بنام اسداللہ خاں غالب"

اے مسیحِ زماں توئی دانی، بنجابت ارادتے کہ مراست
بوعلی کے رسد بہ تشخیصت کہ فلاطوں مثال تو داناست
می سزد گر بگوییت بقراط در فلاطوں بخوانمت زیباست
مسہل (کذا) دادی و بفرمودی بعمل آر بگیاں کہ شفاست
زاں عمل دور شد مرض بالکل گر بگویم توئی مسیح بجاست

اس قطعے کے جواب میں مرزا غالب نے ایک قطعہ اسی زمین میں فی البدیہہ کہہ کر ابوالقاسم کو بھیجا۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قاسم نے جس شخص کی معرفت اپنا قطعہ غالب کو بھیجا تھا اسی کے ہاتھ دال اور اچار بھی بھیجا تھا۔ چنانچہ غالب نے اس تحفے کی شاعرانہ انداز میں تعریف کی ہے اور تحفہ بھیجنے والے کو دعائیں دی ہیں۔ غالب کا وہ قطعہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :-

"قطعہ اسداللہ خان بقاسم"

اے گرامی نژاد والا جاہ کہ درت بابِ سجدۂ امراست
دودمان تو مفخر آفاق بتو نازد اگر زمانہ رواست
فرقِ خورشید را بود افسر ہر غبارے کہ از درت برخاست
امرا زادگانِ ہندستاں ہمسری با تو گر کنند خطاست
نسبت دیگراں بشوکتِ تو ذرہ با مہر و قطرہ با دریاست

دال و آچار سرکہ را نازم — کہ دلِ زار ہر دو را بخواست
مرحبا مرحب تعال تعال — ایں چہ جود و چہ فیض و ایں چہ عطاست
نازم آچار را کہ از ترشی ، — چینِ پیشانیِ بتِ رعناست
آفتابے ز دانہ دانۂ دال — بر سپہرِ خیال جلوہ نماست
از عطائے تو بیش ہم زیں دال — قدرے لطف کردۂ آغاست
اینک آنرا بذوق می پختم ، — کہ وہ ہرگز نہ از مصالح راست
کہ نوازش رقم صحیفۂ تو — برسید و دلم زجا برخاست
گفتم اول جواب بنویسم — زانکہ مکتوبِ قبلۂ جانہاست
سوئے دال ست ایں زماں جانم — دیدنِ قطعہ را دماغ کجاست
سرسری چند شعر بنوشتم — تا نگوئی اسد خموش نواست
تا دریں کارگاہِ شام و سحر — شام تاریک و صبح وقفِ ضیاست
شامِ عیش تو آنچناں روشن — کہ بگویند صبح عشرتہاست
روزِ خصم تو آنچناں تاریک — کہ بدانند ایں شبِ یلداست

یہ قطعہ بھیجنے کے بعد غالبؔ کو خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں کوئی غلطی ہو گئی ہو

ل؎ مرزا ابوالقاسم خاں کے نام مرزا غالبؔ کے خطوں سے چند اقتباسات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ قاسمؔ اس طرح کے تحفے اکثر غالبؔ کو بھیجا کرتے تھے :-

(۱) "کُلچہ پاچہ رسید و کامِ جاں را بہ تبسمِ شور انگیزِ خوباں فرو غلطانید"

(۲) "بندہ بخانہ بودم چوں باز آمدم خوانِ نعمت آمادہ یافتم و سپاس منعم بجا آوردم"

(۳) "نوازشنامہ مع تا نخورشہائے رواں پرور و ذائقہ نواز رسید و بسپاسِ نعمت تر زباں گردانید"

(۴) "تفقد رقم نامہ با ثمرہائے خوشگوار رسید۔ ایزد بخشائشگر بایں مسافر نوازی سلامت دارد"

اور وہ مخالفین کے ہاتھ میں پڑ جائے۔ چنانچہ انھوں نے اُسی دن اُسی زمین میں ایک اور قطعہ کہہ کر ایک خط کے ساتھ بھیجا۔ اس خط میں قاسم کو قسم دے کر لکھا کہ جو قطعہ میں نے آپ کے آدمی کے سامنے نہایت عجلت اور پریشانی میں بغیر فکر کی اعانت کے محض قلم کی مدد سے لکھ ڈالا تھا۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آپ کے قطعہ کا جواب قرار پائے۔ وہ تو گویا فقط دال اور اچار کی رسید تھی۔ اب جو قطعہ بھیج رہا ہوں یہ البتہ آپ کے قطعے کا جواب ہے۔ اس کو جو چاہے دیکھ لے کچھ خوف نہیں ہے۔ غالب کا یہ خط اور قطعہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :-

"رقعۂ اسد بقاسم"

"قبلۂ جان و دل سلامت۔ بامداداں کہ قطعہ در جواب والا نامہ انشا کردہ ام آدمِ حضور گواہ ست کہ در چہ سراسیمگی زودی رقم زدہ ام حاشا کہ جواب قطعۂ جناب را می ارزید۔ گویا غرض از تحریر آں قطعہ رسیدِ دال و اچار بود و دیگر ہیچ۔ اُمید کہ آں را آب بشویند یا بہ آتش بسوزند چہ آں را بے اعانتِ فکر بدستیاریِ خامہ نگاشتہ ام۔ مبادا ستقے واشتہ باشد و بدست معاندین افتد

ــہ خواجہ حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں :-

"کلکتہ کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور اپنے اعتراضوں پر قتیل کا قول سنداً پیش کیا تھا۔ مگر مرزا ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں خسرو کے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے.... انھوں نے قتیل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں دوالی سنگھ فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا۔ اور اہلِ زبان کے سوا کسی کے قول کو قابلِ اسناد نہیں سمجھتا۔ اور اپنے کلام کی سند میں اہلِ زباں کے اقوال پیش کیے۔ اس پر معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضوں کی بوچھار پڑنے لگی۔ اس خط میں معاندین سے یہی معترضین مراد ہیں۔

جناب سید الشہدا علیہ السلام سوگند کہ آں را کس تماشید داز ہم بگزراند قطعہ کہ دریں ورق مرقوم است جواب قطعہ مرقومہ آں مخدوم است ہر کہ خواہد بنگرد محابا نیست۔ شب رفتہ من نیز مسہلے از روغن بید انجیر و نمک آب آشامیدہ بودم اما طبع آترا پزیرفت در رفع قبض نشد۔ امروز بطور خود ترکیبے کہ برفعل سہلِ شبانہ موید باشد بعمل آوردہ ام۔ بجدا کہ اگر ایں گریوہ با درراہ نداشتے قطعہ را خود مثانع روے دست اخلاص ساختہ بملازمت رسیدے۔ اگر مرگ اماں داد دریں دو سہ روز بسعادت پابوس رسیدہ خواہد شد۔

"قطعہ دوم در جواب قطعہ قاسم"

قدر دانا لطیفہ دارم | بپزیری اگر ز بندہ رواست
کلک اندیشہ ام ازیں تحریر | آب در رنگ نشاطِ طبع تو خواست
بندہ را از کرم ستودستی | مشت خاشاک را چہ قدر و بہاست
بو علی و مسیح و افلاطوں | ہر چہ گفتی بگو کہ از تو سزاست
بے ادب باشم از کنم تکذیب | بے خرد باشم ار شمارم راست
نسبت من بہ بو علی سینا | صاف ہمچوں سراب با دریاست
بو کہ در چار سوے کلکتہ | کہ چنیں قحطِ حکمت و حکماست
بو علی گفتنم روا باشد | خرس در کوہ بو علی سیناست
سپس از شوخی ندیمانہ، | گویم احوالِ قطعہ کہ تراست
نقطش آئینہ دارِ حسن ادا | معنیش بود و تار فکر رساست
نقطہ حرف حرف اشعارش | مردمِ چشم مردم بیناست
اے روانم فدائے ہر سخنت | مرحبا ایں چہ طبع معنی زاست

تو کلیمی بر اوجِ طورِ سخن، | پنجہ بر ساعدت ید بیضاست
در صفِ دشمناں ز بہرِ نہیب | خامہ را در کفِ تو حکم عصاست
از منِ اصلاح آرزد کردن | سر بسر ہیچکس نواز بہاست
چوں تو خود دادۂ قسم بہ خدا | بخدا ہر چہ ہست نیک و بجاست
لیکن ایں بیت زاں ہمہ ابیات | خلشے دارم ار نگویم راست
تسہل دادی ولیغز مودی، | بعمل آر بگماں کہ شفاست
آخرِ لفظ مسہل از سرِ سہو | کسرہ بنوشتہ و موقع یاست
یائے توحید برنگار ایں جا | کسرہ خود بے مضاف الیہ خطاست
فنِ انشا زیاں نگرد ازیں | لیک عیب طریقۂ املاست
بدعا ختم می کنم نامہ، | زانکہ سرمایۂ فقیر دعاست
وقف تو باد از خزانۂ غیب | ہر چہ در دین و ہر چہ در دنیاست
شاد و خرم بزی کہ در دو جہاں | دستگیرِ تو سید الشہداست

اہلِ نظر دونوں قطعوں کا مقابلہ کریں اور دیکھیں کہ اگر یہ قطعہ غالب کے کمالِ فن کی سند ہے تو پہلا قطعہ اُن کی حاضر دماغی اور بدیہہ گوئی کی دستاویز۔

مرزا غالب کی ایک ہنگامہ خیز مثنوی

اپنی کتاب یادگارِ غالب میں خواجہ حالی نے غالب کی ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے اور اس کا سببِ تصنیف یہ لکھا ہے :-

" ایک بار بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر بادشاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے، وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے۔ ان کا مذہب اثنا عشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہُوا تو مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاکِ شفا دی گئی اور اُس کے بعد بادشاہ کو صحت ہوگئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائے گی تو حضرت عباس کی درگاہ میں، جو لکھنؤ میں ہے، عَلم چڑھاؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے لکھنؤ جاکر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے، حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا، اور انھوں نے بڑی دھوم دھام سے عَلم چڑھایا، جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرا و علما سب شریک تھے اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے عَلم چڑھوایا گیا۔ اِس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے۔ اِس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا، اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے

اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شائع کراتے۔ اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کراتے گئے۔ اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی، جس کا نام غالباً دمغ الباطل رکھا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔"

خواجہ حالی کے اِس بیان میں کئی غلطیاں ہیں، جن میں دو بہت نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے مرزا حیدر شکوہ کو مرزا سلیمان شکوہ کا بیٹا اور اکبر شاہ کا بھتیجا بتایا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مرزا حیدر شکوہ مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے نہیں تھے بلکہ ان کے بیٹے مرزا کام بخش کے بیٹے تھے یعنی مرزا سلیمان شکوہ کے پوتے تھے۔ اور اکبر بادشاہ مرزا سلیمان شکوہ کے بڑے بھائی تھے۔ اِس سلسلے میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ بہادر شاہ ظفر اکبر شاہ کے بیٹے تھے۔ اِس لیے وہ مرزا حیدر شکوہ کے چچا ہوتے۔ مرزا حیدر شکوہ اپنی مثنوی شوکتِ حیدری میں خود کہتے ہیں :-

جناب بہادر شہِ نامدار کہ ہم عمّ ماہست و ہم شہریار

دوسری غلطی یہ ہے کہ دمغ الباطل مرزا غالبؔ کی مثنوی کا نام قرار دیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نام کسی مثنوی کا نہیں بلکہ صہبائی کی مثنوی کا نام تھا، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ غالبؔ کی زیرِ بحث مثنوی کا غالباً کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا۔

عَلم کے قضیّے کے متعلق خود مرزا حیدر شکوہ کا بیان یہ ہے کہ جس زمانے میں وہ کلکتے میں مقیم تھے۔ بہادر شاہ ظفر بیمار ہوتے۔ اسی بیماری کی حالت میں انھوں نے ایک خواب میں خود کو حضرت عباس کی درگاہ میں عَلم چڑھاتے ہوئے دیکھا اور ایک خط میں مرزا حیدر شکوہ کو اس خواب کا حال لکھ بھیجا۔ جب بہادر شاہ کو صحت ہوئی انھوں نے ایک سونے کا عَلم بنوا کر مرزا حیدر شکوہ کے بھائی مرزا نورالدین کے ہاتھ

لکھنؤ بھیجا۔ جب حیدر شکوہ کلکتے سے واپس آتے اور بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو انھوں نے اِس خواب اور عَلم کا حال زبانی بھی اُن سے بیان کیا۔ اور لکھنؤ کے مجتہد سلطان العلماء مولوی سیّد محمد صاحب کے نام ایک خط لکھ کر مرزا حیدر شکوہ کی معرفت روانہ کیا۔ انھیں کے ہاتھ ایک خط مرزا نور الدین کو بھی بھیجا جس میں ان کو لکھا کہ معلوم نہیں عَلم حضرت عباس کی درگاہ پر چڑھا دیا گیا یا نہیں۔ اگر نہ چڑھایا گیا ہو تو جلد چڑھا دیا جائے قِصّہ مختصر مرزا حیدر شکوہ کی معرفت بہادر شاہ کا خط وصول ہونے کے بعد مجتہد العصر نے ۶۔ ربیع الاوّل ۱۲۷۰ھ کو وہ عَلم شاہی انتظام اور شاہانہ جلوس کے ساتھ حضرت عباس کی درگاہ میں چڑھا دیا۔ یہ خبر کچھ جھوٹے سچے حاشیوں کے ساتھ دہلی پہنچی اور وہاں کے علما و مشائخ نے بہادر شاہ کو دھمکی دی کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو جمعہ اور عیدین کی نماز کے خطبے سے ان کا نام نکال دیا جائے گا۔ اِس خوف سے بہادر شاہ مکر گئے اور یہ ظاہر کیا کہ مرزا حیدر شکوہ اور مرزا نورالدین نے ان کی بیماری کے زمانے میں ان کی صحت کے لیے اپنے مذہب کے موافق عَلم چڑھانے کی نذر مانی تھی، جس کو انھوں نے اپنے طور پر پورا کیا ہے

عَلم کے قضیتے نے بہت طول کھینچا اور اس کے بارے میں بہت خط و کتابت ہوئی۔ اِس سلسلے کی تمام اہم تحریریں مرزا حیدر شکوہ نے ایک رسالے میں جمع کر دی ہیں۔ اِسی رسالے میں انھوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کل مغل بادشاہ مذہباً شیعہ تھے۔ اور اس دعوے کے کچھ ثبوت بھی پیش کیے ہیں۔ یہ رسالہ ۱۲۷۰ھ میں رسالۂ حیدری در عقائد سلاطین تیموری کے نام سے لکھنؤ میں چھپا تھا اور اس کا ایک نسخہ راقم کے ذخیرہ کتب میں موجود[1] ہے۔

---

[1] اس رسالے کے ساتھ مثنوی شوکت حیدری بھی شامل ہے، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ ادیب

غالب کی مذکورہ بالا مثنوی کے بارے میں خواجہ حالی تحریر فرماتے ہیں :-

" اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی، بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے ؟ مرزا نے لکھ کر بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اس کی تکمیل کرتا ہوں۔ اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں۔"

یہ مثنوی بہادر شاہ کی طرف سے لکھی گئی تھی مگر خواجہ حالی کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو غالب نے نظم کیا تھا اور خود اس کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو لوگوں نے کلام کی شان سے اندازہ کر لیا کہ یہ غالب کے قلم سے نکلی ہے۔ چنانچہ اس مثنوی کے جواب میں جو مثنوی کہی گئی اس کے ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے :-

خصم گردد ز قہر او منکوب　　　گرچہ "غالب" بود شود مغلوب

مجتہد العصر سلطان العلماء مولوی سید محمد صاحب کے بھتیجے زبدۃ العلما مولوی سید علی نقی صاحب کا قلمی کشکول جو حکیم سید علی صاحب آشفتہ مرحوم کے پاس موجود تھا، اس میں غالب کی یہ مثنوی بھی نقل کی گئی ہے اور اُس کے عنوان پر "مثنوی مرزا نوشہ غالب" لکھا ہوا ہے۔ اس کشکول میں وہ تحریریں بھی نقل کی گئی ہیں جو رسالہ علم حیدری .. میں شامل ہیں اور ان کے علاوہ اس سلسلے کی چند تحریریں اور بھی اس میں موجود ہیں۔

غالب کی یہ مثنوی یوں شروع ہوتی ہے :-

بلہ ہاں اے دقیقہ اندیشاں　　حق پرستاں و معدلت کیشاں
تر زبانان وصف جہد و جہاد　　رازدانان دین و دانش و داد
شاہی باید ہر حادث نیست　　زبر تحلۂ حوادث نیست
یافت ہر کس کہ حسن عنوانش　　منتہی تا بہ یافت اعلانش!
زاں نشانگاہ تا صفی اللہ،　　بود ہر دیدہ در بنی اللہ
شد بہ نیروے ایں دلیل درست　　کہ نیاگان ما ز روز نخست
یا گرامی پیمبراں بودند،　　یا گراں مایہ سروراں بودند

غالبؔ کی مثنوی کے جواب میں جو مثنوی لکھنؤ میں کہی گئی تھی وہ "مثنوی شیعیانِ علی دررد مثنوی جبلی دہلی" کے نام سے ۱۲۷۰ھ میں چھپی تھی۔ اس میں غالبؔ کے اشعار اور ان کے جواب قولہٗ اور جوابہٗ کے عنوان سے درج کیے گئے ہیں۔ اِس طرح غالبؔ کی پوری مثنوی اس میں شامل ہو گئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے اِس جوابی مثنوی میں مصنف کا نام نہیں بتایا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خواجہ آتشؔ کے شاگرد میر دوست علی خلیلؔ کی تصنیف ہے۔ اِس مثنوی کے چند ابتدائی شعر نقل کیے جاتے ہیں:-

گر بود لطف ایزد متعال　　سایہ گردد ہماے اوج کمال
برہمن شیخ بے ریا گردد،　　رند میخوار پارسا گردد
بادہ گردد بجام آب حیات　　خط ساغر شود سبیل نجات
خصم گردد ز قہر او منکوب　　گرچہ غالب بود شود مغلوب
ابر فیضش بود چو سایہ فگن　　گل چین دانہ می شود خرمن
مور و لطف حق چو شد انساں　　می نماید تمیز سود و زیاں
چوں ز تائید خالق عالم　　بر ظفر بادشاہ مہر خدم

گام زد بر طریقِ صدق و یقیں یافت ملکِ یقین و دولتِ دیں
یا علی و لی تولّا کرد در طریقِ زبوں تبرّا کرد
ذرہ گردید نیّرِ اعظم شد چراغِ کنشت شمعِ حرم
ناریاں را ازیں خبر چو رسید آتشِ کینہ شعلہ ور گردید
بست بر شہ غلط بد آئینے شعر کے چند گفت بے دینے
تہمتے بست از رہ تزویر بر خیالِ پادشاہِ پاک ضمیر
کرد منسوب ناصب مبہوت خزف خود بہ معدنِ یاقوت
ہر چہ موزوں نمود بے سو راست قول ایں شعلہ زادہ مردود است

اس کے بعد مذہبی مناظرہ شروع ہو گیا ہے اور اصل مثنوی میں جو سخت کلامی کی گئی ہے، اس کا جواب ترکی بہ ترکی دیا گیا ہے۔

جب یہ مثنوی دہلی پہنچی تو یہ خبر بھی پہنچ گئی کہ اس کا مصنف کون ہے۔ اس مثنوی کے جواب میں شیخ امام بخش صہبائی نے دمغ الباطل کے نام سے ایک مثنوی لکھی، جو سنہ ۱۲۶۱ھ میں افضل المطابع، دہلی میں چھاپی گئی۔ اس مثنوی میں لکھنؤ والی مثنوی کے مصنف میر دوست علی خلیل ہی قرار دیے گئے ہیں۔ مثنوی کے ابتدائی حصے میں صہبائی نے ان کے نام کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:-

ردِّ آں کرد مرتد ازلی ، دشمن است آنکہ نیست دوستِ علی

اور آخری حصے میں ایک جگہ نام اور تخلص دونوں لاتے گئے ہیں:-

دشمنی از کلام تست جلی بغلط گشتۂ تو دوستِ علی
اے بد انجام زشت آبائی باز آ زیں کلام آرائی
ورنہ چنداں ذلیل خواہی شد کہ بگیراں خلیل خواہی شد

اور اسی سلسلے میں کنایۃً یہ بھی کہا ہے کہ اس مثنوی کی تصنیف میں مفتی میر محمد عباس صاحب

شوستری نے خلیق کو مدد دی ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کا رنگ کالا تھا۔ اس لیے صہبائی نے ان کو لفظ 'سیاہ' سے یاد کیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

پند من بشنو و بہانہ مگیر بگذر از صحبت سیاہ شریر
ایں سیاہت تباہ خواہد کرد دل چو رویت سیاہ خواہد کرد

مفتی صاحب کا قیام اُن دنوں کلکتے میں تھا۔ جب دمغ الباطل ان کی نظر سے گزری تو شریف العلما مولوی حاجی سید شریف حسین ابن ارسطو جاہ مولوی حاجی سید رجب علی خاں کی فرمائش پر انھوں نے اس کے جواب میں مثنوی خطاب فاصل لکھی جو ۱۲۶۹ھ میں شروع اور ۱۲۷۰ھ میں ختم ہوئی۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے، جو مطبع مجمع البحرین لودھیانہ میں ۱۲۸۲ھ میں چھپا تھا۔

خطاب فاصل میں 'قال المبطل' کے عنوان سے صہبائی کے اشعار لکھ کر 'نقول الحق' کے عنوان سے ان کا جواب دیا گیا ہے۔ اس طرح پوری مثنوی دمغ الباطل اس میں آگئی ہے۔ خلیق کی مثنوی کے اشعار بھی 'قال الخلیل' کے عنوان سے جگہ جگہ درج کیے گئے ہیں اور یہ مناظرے کی ایک ضخیم کتاب ہوگئی ہے، جو تقریباً چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ذیل میں مثنوی خطاب فاصل کے ابتدائی حصّے سے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں، جن سے اس مثنوی کا 'سبب تصنیف' معلوم ہوتا ہے:۔

ایں زماں کاں ز ہجر نبویست شش و ہفتاد و یک ہزار و دویست ۔
ورقے چند با چپہ آمد ظلمتِ کفر در نظر آمد
نظم مربوط بود بندش نغز لیک مانند نے ہمہ بے مغز
غالباً از کلام غالبؔ بود کہ سوے شاہ نسبتش بنمود
پس خلیقؔ دوستِ علی عاشق صادق علی ولی
از سوادِ عیون حور بہشت رو بر آں نامۂ سیاہ نوشت

سالیا دیگرے ز قوم ذلیل — رد نوشتت بر کلام خلیل
ہیچ از ننگ و نام بخشش نیست — جز بر نام از امام بخشش نیست
من ندارم بادشنا ساقی — چیست صہبا و کیست صہبائی
بر خلیل جلیل بر دگماں — کہ بہ خیر دے من کشیدہ کماں
لاجرم برمنش عتابے ہست — طعن و طنزے و پیچ و تابے ہست
طعنہ بر ما بجلے خورد زدہ است — خود در فتنے بپلے خورد زدہ ہست
ردّ او را چو بندہ بنویم — عیب او یست کندہ بنویم
دیدہ گر تو دمغ باطل را — بنگزیم خطاب فاصل را
ایں ستم در حدود کلکتہ — ہست معلوم حالش البتہ
نیست ایں جا ماخذ و نہ مواد — می نویسم جواب او بریاد

اختصار کے لیے ان شعروں کے درمیان سے بہت سے شعر حذف کر دیتے گئے ہیں۔

اِس سلسلۂ مثنویات کی پہلی کڑی، جو غالب کی طرف منسوب ہے، اس کے جواب میں ایک مثنوی شاہزادہ مرزا حیدر شکوہ نے بھی کہی تھی اور اس کا نام اپنے نام کی رعایت سے شوکت حیدری رکھا تھا۔ یہ مثنوی رسالہ علم حیدری کے ساتھ بھی چھپی تھی اور علیحدہ بھی۔ اس کا ایک نسخہ سنہ ۱۲۷۰ھ کا چھپا ہوا میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ مثنوی سلطان عالم (واجد علی شاہ) کو نذر کر دی تھی۔ اس مثنوی میں بھی کہا گیا ہے کہ جو مثنوی بہادر شاہ کی طرف منسوب کی گئی ہے وہ بادشاہ کی تصنیف نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس میں بادشاہ کے اجداد کے

حاشیہ: صہبائی کا نام امام بخش تھا۔ ادیب

نام صحیح نہیں لکھے گئے ہیں :

نہ شہ بہرِ من مثنوی گفتہ است ۔۔۔ یکے خارجی دہلوی گفتہ است
دراں مثنوی اودر بنام ظفر ، ۔۔۔ خزف جمع کردہ بجائے گہر
نہ حمد خدا و نہ نعت رسولؐ ۔۔۔ سراپا دروغ و سراسر فضول
نشان غلط داد واں بے نشاں ۔۔۔ دراجداد شہ نیست چنگیز خاں
چناں کفر در باطنش جوش کرد ۔۔۔ نسب ہم زخاطر فراموش کرد

یہ پانچوں مثنویاں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ، فارسی زبان میں ہیں اور ان میں سے تین کے مصنف فارسی کے مشہور و معروف ادیب اور شاعر ہیں ۔ صہبائی فارسی کے اُستاد سمجھے جاتے تھے ، غالب کی فارسی نثر و نظم کا ہندوستان بھر میں ڈنکا بج رہا تھا ، مفتی میر عباس ایک جیّد عالم اور فارسی و عربی کے زبردست ادیب اور شاعر تھے ۔ ان کی علمیت و ادبیت کی شہرت ایران و عراق تک اور ان کی تصنیفوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی تھی ۔ میر دوست علی خلیلؔ اُردو کے ممتاز شاعر تھے مگر ان کی یہ مثنوی بتاتی ہے کہ ان کی فارسی نظم بھی چُست و درست ہوتی تھی ۔ مرزا حیدر شکوہ کی نظم میں بھی پختگی اور روانی کی صفتیں موجود ہیں ۔ مختصر یہ کہ یہ پانچوں مثنویاں ادبی حیثیت سے اچھی خاصی دلچسپی کی حامل ہیں ۔ مگر چونکہ اس سلسلے کی پہلی مثنوی کا لہجہ تند تھا ، اس لیے ہر جوابی مثنوی کا لہجہ تند تر ہوتا گیا اور چونکہ ان میں دو فریقوں کے مذہبی نزاعی مسئلے زیرِ بحث تھے ، اس لیے کلام میں تلخی بڑھتی گئی ۔

زبدۃ العلما مولوی سید علی نقی کے جس کشکول کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے ، اس میں غالب کا ایک سلام بھی ہے جو انھوں نے سلطان العلما مولوی سید محمد صاحب کو ۱۲۷۰ھ میں بھیجا تھا ۔ یہ سلام رسالہ مبصر لکھنؤ کے مئی ۱۹۲۹ء کے پرچے میں شائع ہُوا تھا اور اسی پرچے سے اس کتاب میں نقل کیا گیا ہے ۔

ایک ایرانی شاعر گل محمد خاں ناطق مکرانی ہندوستان آیا اور مدت تک لکھنؤ میں مقیم رہا۔ یہاں کے قیام کے دوران میں اودھ کے بادشاہوں اور امیروں کی مدح میں بہت سے قصیدے کہے اور ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کے شاگرد جواہر سنگھ جوہر نے اس کا متفرق کلام جمع کر کے ایک مختصر سا دیوان مرتب کیا اور اس کا تاریخی نام جوہر معظم رکھا۔ دیوان کے آخر میں ناطق کے چند خط بھی شامل ہیں۔ ان میں وہ خط بھی ہے جو ناطق نے مرزا غالب کو لکھا تھا اور جس میں غالب کے ایک شعر پر یہ اعتراض کیا تھا کہ سور کے پنجے نہیں ہوتے، سُم ہوتے ہیں۔ غالب نے اس خط کا جو جواب دیا تھا وہ پنج آہنگ میں موجود ہے۔ ناطق کا خط اور غالب کا جواب یہ دونوں چیزیں مولوی رفعت علی رفعت رسول پوری کے قلمی مجموعۂ نظم و نثر میں بھی شامل ہیں۔ رفعت ناطق اور غالب کے ہم عصر تھے اور لکھنؤ میں امرا کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ ناطق کا خط اس کے دونوں نسخوں کا مقابلہ کرنے کے بعد اختلاف نسخ کے ساتھ ضمیمے کے طور پر اس کتاب میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس سے غالب کے اس خط کو سمجھنے میں مدد ملے گی جو انھوں نے ناطق کو لکھا تھا۔

یہ مجموعۂ متفرقات دو حصّوں اور تین ضمیموں پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔ حصّۂ اوّل مکتوباتِ غالب پر اور حصّۂ دوم منظوماتِ غالب پر مشتمل ہے۔ ضمیمۂ الف میں ناطق کا خط غالب کے نام ہے۔ ضمیمہ ب میں اس مثنوی کا ابتدائی حصّہ ہے جو غالب کی بے نام مثنوی کے جواب میں کہی گئی تھی اور ضمیمۂ ج میں ولایت اور عزیز صفی پوری کے قلم سے 'غالب دہلوی سے اصلاح لینے کا حال' ہے۔

غالب کے دو تعزیت نامے اور چچا جان

مرزا غالب کا ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ہے، جس میں انھوں نے مہر کی محبوبہ کے انتقال پر تعزیت ادا کی ہے اور تعزیت میں ظرافت کا پہلو پیدا کرکے انشا پردازی کا وہ کمال دکھایا ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اس خط کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے :۔

"شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی، تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی یہ مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم دونوں کو بھی کہ زخم مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مہر اس خط کو پڑھتے جاتے ہوں گے اور ان کا دل ہلکا ہوتا جاتا ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ جب اِن جُملوں پر پہنچے ہوں گے

"بھئی مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار

رکھتے ہیں۔"

تو غم کے بادل چھنٹ چکے ہوں گے اور جب اس کے یہ جملے نظر آتے ہوں گے۔

"میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔"

تو چہرے پر مسکراہٹ نمایاں ہوگئی ہوگی۔ روتوں کو ہنسانے کی اس سے بہتر مثال کہاں ملے گی۔

یہ خط بھیجنے کے کچھ دن بعد مرزاؔ نے مہر کو دوسرا خط لکھا۔ وہ بھی اس سانحے کی تعزیت کے سلسلے میں ہے اور اس میں بھی ظرافت نگاری کا یہی کمال صرف کیا گیا ہے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

"کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجالاؤ، غم نہ کھاؤ۔ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی، میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے، کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردین کاخ وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بددور وہی ایک حور۔"

اس عبارت میں یہ جملہ "اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان" پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہاں چنا جان اور منا جان سے کوئی خاص عورت مُراد نہیں ہے۔ بلکہ مہر کی محبوبہ کوئی بازاری عورت تھی اور نہ غالبؔ نے اس طبقے کی عورتوں کے دو مشہور نام لکھ دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نہ بازاری عورتوں کی کمی ہے اور نہ ان کا ملنا دشوار ہے۔ اگر ایک عورت نہ رہی تو ویسی ہی دوسری

مل سکتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چنا جان مہر کی محبوبہ کا نام تھا، جس کی تعزیت میں غالب نے مذکورہ بالا دو خط لکھے ہیں۔

چنا جان کی زندگی کے حالات تو معلوم نہیں۔ ان کی موت کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ ورم جگر کے مرض میں اُن کی جان گئی۔ ۱۲۷۶ھ میں ذیقعدہ کی نویں تاریخ پنج شنبہ کے دن ان کا انتقال ہوا اور شب جمعہ کو وہ سپرد خاک کی گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ چنا جان بڑی دین دار اور عبادت گزار تھیں۔ مہر نے اُن کے انتقال پر گیارہ قطعات تاریخ کہے ہیں، جن میں کئی جگہ ان کو "مومنہ" کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ مہر کے بھائی مرزا عنایت علی ماہ نے اپنے قطعہ تاریخ میں مادۂ تاریخ میں نکالا ہے "مرقد مومنہ و زاہدہ شیدائے بتول" مہر کے دوست مولوی عبدالوہاب نے پانچ قطعات تاریخ کہے ہیں۔ ایک قطعے کا پہلا شعر یہ ہے :۔

رفت اے واز دہر چنا جان   آنکہ می کرد طاعت اللہ را

اور دوسرے شعر کا پہلا مصرع یہ ہوا۔

فاطمہ را کنیز بود از دل

اسی قطعے کا ایک شعر یہ ہے :۔

جاں بہ جان آفریں سپرد و نمود   طے بہ ایمان کامل ایں رہ آہ

ایک دوسرے قطعے میں انھوں نے بھی چنا جان کے لیے "مومنہ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مہر نے ایک جگہ چنا جان کا نام کئی توصیفی فقروں کے ساتھ اس طرح لکھا ہے :۔

"شیدائے اہل بیت طاہرین اور دالۂ پنجتن پاک دائمہ معصومین، فریفتۂ شہدائے کربلا، مفتون حضرات آل عبا، کنیز فضہ، خاک نعلین فاطمہ زہرا علیہا السلام چنا جان نام"

تمہر چتا جان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ ایک حج شنبے کو ان کے ایک دوست بھی ساتھ تھے۔ قبر پر پہنچ کر تمہر نے کسی کا یہ مطلع پڑھا :

ہزار حیف کہ با ہیچو حال زار آیم تو مردہ باشی ومن زندہ بر مزار آیم

اس کو سُن کر ان کے دوست نے یہ مطلع پڑھ دیا :۔

چہ خون جگر در عدم خوردہ باشم تو بر خاکم آئی ومن مردہ باشد

تمہر کہتے ہیں کہ یہ مطلع سُن کر میرے دل پر غم کی گھٹا چھاگئی اور میری جان ہونٹوں پر آگئی۔

چتا جان کی موت سے متاثر ہو کر تمہر نے ایک مسدس اور دو غزلیں کہی تھیں۔ اس مسدس کے چند بند اور ان غزلوں کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :۔

اِک ماہ رو کا داغ ہوا تمہر کے لیے تا گور یہ چراغ ہوا تمہر کے لیے
گلشن جہاں کا باغ ہوا تمہر کے لیے لبریز سم ایاغ ہوا تمہر کے لیے

رحمے بہ غربت دلِ دیوانہ اش کنید
رقت بہ گریہ ہائے غریبانہ اش کنید

نقد سرور عشق وطرب سب تلف ہوا ہنگامہ گرم ساز دل پر شغف ہوا
سینہ خدنگ رنج والم کا ہدف ہوا بیت الملال تمہر کا بیت الشرف ہوا

از بے دلی بہ کنج غم عہد بستہ است
در بیکسی بہ ماتم خود خود نشستہ است

ہمیں کیا کام اگر کوئی حسیں ہے ہمارا چاہنے والا نہیں ہے
انیسِ کنج تنہائی رہا کون فقط مَیں ہوں دل اندوگیں ہے
ملے ہیں خاک میں گل رو ہزاروں عجب گلزار اک زیر زمیں ہے

نہیں مَیں دیکھتا بے وجہ اس کو
ترا ہم شکل ماہِ مبیں ہے
غزل میں بھی کہو مہرؔ ان کی تاریخ
"جواں مرحومہ دخلد بریں ہے"

خوشی کی بات پر بھی غمزدے کب شاد ہوتے ہیں
ہمارے سامنے اب کوئی ہنستا ہے تو روتے ہیں
تڑپڑے آنسوؤں کے پڑ رہے ہیں دیدۂ تر سے،
نہیں چھٹتا یہ داغ دل ہمارا روز دھوتے ہیں
اگر ہم چشم ہے اپنی تو بے شک شمع تربت ہے
کہ وہ بھی اور ہم بھی دونوں اِک عالم میں روتے ہیں
خبر آئندہ کی دیتے ہیں کیوں کر بے خبر کہیئے،
ہمیں غفلت سے چونکاتے ہیں خود مرقد میں روتے ہیں
دعا گو لکھو اے مہرؔ تاریخ اس غزل میں بھی،
"جناں میں وہ بنے دائم یہاں ہم جس کو روتے ہیں"

چنا جان کے بارے میں اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کے ایک رسالے سے ماخوذ ہے جس کا تاریخی نام "بیان بخشائش ہے" اور جو مطبع حیدری آگرہ میں ۱۲۷۰ھ میں چھپا تھا۔ اِس رسالے کا جو نسخہ میرے کُتب خانے میں ہے اس کے آخر میں مہرؔ نے چند سطریں اور قطعۂ تاریخ اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنے دستخط کر دیتے ہیں۔ اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالے کی طباعت کے اخراجات نواب مرزا محمد علی خاں بہادر نے عطا کیے تھے۔ مہرؔ نے ان کا نام ان القاب کے ساتھ لکھا ہے۔ "فاضل اجل، عالم باعمل، رئیس ذی توقیر، امیر ابن امیر" اور قطعۂ تاریخ حسب ذیل ہے :۔

عجب روکش مہر انور ہے یہ
ہزاروں دفاتر سے بہتر ہے یہ

حزیں سے کہا جب کہ تاریخ کو — وہ بولا "مصیبت کا دفتر ہے یہ"

۱۲۷۷ ہجری

مہر کے دیوان الماسِ درخشاں میں دو قطعہ تاریخ ہیں، جن کے عنوان "تاریخ آغاز بنائے مسجد چنّا جان" اور "تاریخ مسجد چنّا جان" ہیں۔ یہ دونوں قطعے ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں :-

از حیدری و پنّی و منّا و چنّا جان — در کربلا ببیں چہ بنا گشت مسجدے
تحریر کرد مصرعِ تاریخ کلکِ مہر — اللہ اکبر ایں چہ بنا گشت مسجدے

۱۲۴۸ ہجری

اس مسجد بلند کا شمسہ ہے آفتاب — ہردم رکوع میں ہے یہاں گنبد سپہر
بانی ہیں پنّی منّا و چنّا و حیدری — "تعمیر بت یہ کعبہ ہے" تاریخ لکھ دے مہر

اِن قطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چنّا جان نے ایک مسجد بنوائی تھی، جس کی تعمیر ۱۲۴۸ھ میں شروع ہوئی اور ۱۲۴۹ھ میں تمام ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر میں حیدری، پنّی اور منّا بھی چنّا جان کے ساتھ شریک تھیں۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ تینوں چنّا جان کی بہنیں ہوں۔ ان کے ناموں میں "جان" کا لفظ شامل ہوگا جو یہاں حذف کر دیا ہے۔ اسی طرح دوسرے قطعے میں چنّا جان کا نام فقط چنّا لکھا گیا ہے۔ غالب نے تو اپنے خط میں چنّا جان کے ساتھ منّا جان محض قافیے کی رعایت سے لکھا ہوگا، مگر اتفاق سے وہ چنّا جان کی رفیقِ کار نکلیں۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ چنّا جان کا انتقال ۱۲۷۶ھ میں ہوا۔ غالب نے مہر کو پہلا

تنزتی خط اسی سنہ میں لکھا ہوگا۔ اس خط میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے :۔

"وہ بھی مغل بچے غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ میں نے بھی عمر بھر میں ایک کو مار رکھا ہے چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔"

غالبؔ کے اِس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوئی محبوبہ تھی جس کا انتقال ۱۲۷۶ھ سے چالیس بیالیس برس پہلے یعنی ۱۲۳۵ھ کے قریب ہوا تھا۔ غالبؔ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے اس واقعے کے وقت اُن کی عمر کم و بیش ۲۲ برس کی ہوگی۔

غالبؔ کی محبوبہ کا نام و نشان تو معلوم نہیں، مگر قیاس کہتا ہے کہ اسی کی موت سے متاثر ہو کر انھوں نے وہ غزل کہی ہوگی جس کا مطلع یہ ہے :۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے ․․․ کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

اس غزل کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں :۔

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا ․․․ عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں ․․․ ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی ․․․ اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا ․․․ دل پہ اِک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال ․․․ ایک دل تس پر یہ نااُمیدواری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ ․․․ رہ گیا تھا دِل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی مرحوم نے دیوانِ غالبؔ کی شرح میں اس غزل کے متعلق سچ کہا ہے کہ "یہ ساری غزل معشوق کا مرثیہ ہے" اس پر اتنا اضافہ ضرور کر لینا چاہیئے کہ یہ کسی فرضی معشوق کا مرثیہ نہیں ہے، بلکہ شاعر نے اپنی محبوبہ کے انتقال پر اپنے سچے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

غالبؔ کے قدرشناسوں کو چچا جان کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ اُن کی بدولت اس شاعر بزرگ کی زندگی کا ایک خاص واقعہ پردے سے باہر آ جاتا ہے اور اُس کا زمانۂ وقوع بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ اس کی ایک غزل کی شان نزول کا سُراغ لگانے میں بھی مدد ملتی ہے۔

مقدمہ ــــ متفرقاتِ غالب

مرزا غالب کے غیر مطبوعہ اور نادر مکتوبات و منظومات کا یہ مجموعہ جو متفرقات غالب کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے، غالب کے قدردانوں کے لیے خاص دلچسپی کا باعث ہو گا اور غالب کی حیات، سیرت اور شخصیت کے بارے میں بہت سا نیا مواد فراہم کر دے گا۔ اس مجموعے میں جو چیزیں شامل کی جا رہی ہیں ان کے بارے میں کچھ ضروری باتیں ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

میرے کتب خانے میں ایک بیاض ہے، جس میں مرزا غالب کے اڑتالیس فارسی خط، دو فارسی مثنوی، اور ایک اردو غزل بھی شامل ہے۔ یہ کل خط ایسے لوگوں کے نام ہیں جو کلکتے میں مقیم تھے۔ اور یہ سب نقلیں ایسی ہیں جو غالب نے کلکتے کے قیام کے زمانے میں کی تھیں۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کسی کلکتے کے رہنے والے ہی نے یہ تمام چیزیں اس بیاض میں جمع کی ہیں۔

اس بیاض میں جو خط شامل ہیں وہ ایک کے سوا سب فارسی میں ہیں اور اُن میں آخر کے بیس خط مرزا ابوالقاسم خان قاسم کے نام ہیں۔ ان خطوں سے پہلے قاسم کا ایک قطعہ غالب کے نام اور غالب کے دو قطعے قاسم کے نام ہیں اور عنوان پر عبارت درج ہے۔

دو قطعہ نوشتۂ ابوالقاسم خان برائے اسداللہ خاں غالب و دو قطعہ

در ہماں بجر دو قافیہ مع چند رقعات کہ غالب بہ قاتم در سلک تحریر کشید
دریں قراطیس تفویض بلامیس نمودہ می آید:

بقیہ خطوں کے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے اکیس[۲۱] خط مولوی سراج الدین احمد کے نام، چھ خط مرزا احمد بیگ خاں کے نام، اور ایک خط ادارۂ جام جہاں نما کے نام ہے۔ مولوی سراج الدین احمد کے نام جو خط ہیں ان میں گیارہ ایسے ہیں جو غالب کی کتاب پنج آہنگ میں شامل ہیں۔ مگر وہاں ان میں سے بہت بہت سی عبارت حذف کر دی گئی ہے اور جگہ جگہ لفظ اور فقرے بدل دیئے گئے ہیں۔ اس لیے یہ خط بھی اپنی اصل صورت میں شائع کیے جارہے ہیں۔ ایسے ہر خط کے آخر میں پنج آہنگ مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ ۱۲۸۵ھ کے اس صفحے یا صفحوں کا حوالہ دے دیا گیا ہے جن میں وہ خط درج ہے۔ اس طرح ان خطوں کا مقابلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

مولوی سراج الدین احمد کے متعلق محمد اکرام اپنی کتاب آثارِ غالب میں لکھتے ہیں:

"کلکتے میں غالب کی ملاقات لکھنؤ کے مولوی سراج الدین احمد سے ہوئی، جن کا اخبار آئینہ سکندر سے کچھ تعلق تھا اور جن کا حکام میں بھی بڑا رسوخ تھا۔ انھیں مرزا کے عزیز ترین دوستوں میں سمجھنا چاہیے اور غالب کے فارسی مکتوبات میں سب سے زیادہ خطوط انھیں کے نام ہیں۔ ان کے ایما پر غالب نے قیام کلکتہ کے دوران میں اپنے اُردو دیوان کا انتخاب اور فارسی کلام گل رعنا کے نام سے جمع کیا۔"

غلام رسول مہر نے اپنی کتاب غالب میں مولوی سراج الدین احمد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ غالباً لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور کاروبار کے سلسلے سے کلکتے میں مقیم تھے۔ غالب نے اُن کے انتقال کے بعد خواجہ غلام غوث بےخبر کو ایک خط لکھا تھا، جس میں اُن کو مخلص صادق الولا، کہا ہے اور ان کی زندگی میں اپنی ایک فارسی غزل کے مقطع میں ان کا ذکر یوں کیا تھا:

باسراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالب نیست آہنگ غزل خوانی مرا[1]

انھیں کی فرمائش پر غالب نے اپنے اُردو اور فارسی کے منتخب شعروں کا مجموعہ گُلِ رعنا کے نام سے مرتب کیا تھا اور اپنی کتاب دستنبو کا ایک نسخہ ان کے پاس بھیجنے کے لیے منشی شیو نراین کو اُن کا پتا یوں لکھنے کی ہدایت کی تھی۔

"در لکھنؤ بہ احاطہ خانساماں متصل تکیہ شیر علی شاہ بہ مکانات مولوی عبدالکریم مرحوم بخدمت مولوی سراج الدین احمد برسد[2]"

مرزا احمد بیگ خاں طپاں اُردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ نسّاخ اپنے تذکرہ شعرا میں لکھتے ہیں :-

"طپاں تخلص مرزا احمد بیگ خاں مرحوم ولد نواب عطاء اللہ خاں، باشندۂ دہلی، مقیم کلکتہ، مختار صدر دیوانی کلکتہ، شاگرد مرزا جان طپش اولاد میں تمغتش خاں والی دشت قبچاق کے تھے۔ دیوان ان کا نظر سے گزرا۔ ۱۲۶۳ھ میں فوت کی۔ مرزا احمد بیگ اپنا تخلص حرف طاء مہملہ سے لکھتے تھے۔"[3]

طپاں کے اُستاد مرزا جان طپش خواجہ میر دردؔ کے شاگرد تھے اور وہ بھی اپنا تخلص حرف طا سے لکھتے تھے۔

غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا احمد بیگ خاں غالب کی بیوی کے

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے یہ غزل سراج الدین احمد کی فرمائش سے کہی تھی اس کا مطلع یہ ہے :- برنمی آید زچشم از جوشش حیرانی مرا + شد نگہ زنار تسبیح سلیمانی مرا !

[2] غالب تیسرا ایڈیشن ص ۱۱۲-۱۱۳

[3] تذکرہ سخن شعرا ص ۳۰۲-۳۰۳

کے سب سے بڑے چچا کے سالے تھے ۔ اس طرح غالب کی اُن سے دور کی رشتہ داری بھی تھی ۔

مرزا ابوالقاسم خاں قاسم دہلی کے شہزادے تھے ۔ غالباً ترک وطن کر کے کلکتے میں مقیم ہو گئے تھے ۔ بینی نرائن جہاں لکھتے ہیں :

"قاسم تخلص ، نام ابوالقاسم خاں ، خاندان بادشاہی سے کچھ قرابت رکھتے ہیں ۔ خاکسار کو بھی ان کی خدمت میں نیاز ہے ۔ بالفعل کلکتے میں تشریف رکھتے ہیں[1] ۔"

نساخ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں :

"قاسم تخلص شہزادہ ابوالقاسم ، اولاد میں امیر تیمور کے تھے ۔ کلکتے میں بھی آئے تھے[2] ۔"

اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں غالب کو فروری ۱۸۲۸ء سے اکتوبر ۱۸۲۹ء تک کوئی پونے دو برس کلکتے میں قیام کرنا پڑا تھا ۔ اس زمانے میں ان سے اور مذکورۂ بالا تینوں شخصوں سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے یا مراسم بڑھ گئے تھے ۔

مرزا احمد بیگ خاں اور مرزا ابوالقاسم خاں دونوں اصل میں دہلی کے رہنے والے تھے اور ان میں اور غالب میں ہم وطنی کا رشتہ تھا جو عالم غربت میں ہمیشہ بہت مضبوط ہو جاتا ہے اور دلی اتحاد اور یک جہتی کا بہت بڑا ذریعہ بن جاتا ہے ۔ غالب کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں کو اپنا بزرگ سمجھتے

---

1. دیوان جہاں قلمی
2. سخن شعرا : ۳۷۰

تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

مولوی سراج الدین احمد ان تینوں صاحبوں کے ساتھ ہم وطنی کا رشتہ تو نہیں رکھتے تھے، مگر بے وطنی کے رشتے نے ان کو بھی اس جماعت میں شریک کر دیا تھا، اور چاروں بزرگوں میں بڑی دوستی اور بے تکلفی ہو گئی تھی۔

مولوی سراج الدین احمد حکام رس آدمی تھے اور ان دنوں مرزا غالبؔ کی پنشن کا مقدمہ چل رہا تھا، اِس لیے ان کے نام جو خط غالبؔ نے لکھے ہیں ان میں زیادہ تر اپنے مقدمے کا ذکر کیا ہے۔

مرزا احمد بیگ خاں صدر دیوانی میں مختار تھے۔ ان سے بھی غالبؔ کو اپنے مقدمے کی پیروی میں مدد مل سکتی تھی۔ مگر وہ دہلی کے رہنے والے تھے اور غالبؔ کے مخالف فریق سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ اِس لیے مقدمے کے معاملے میں غالبؔ ان کو اپنا ہمراز بنانا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

مرزا ابوالقاسم خاں دہلی کے شہزادے تھے اور غالباً اپنی آبائی شان و شوکت کو مٹتے دیکھ کر اور اس روح فرسا منظر کی تاب نہ لا کر وطن سے بہت دُور لکھنؤ میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ان کے نام غالبؔ کے جو خط ہیں ان میں زیادہ تر فقط گھریلو اور نجی باتوں کا ذکر ہے۔

ایک مرتبہ مرزا غالبؔ نے مرزا ابوالقاسم خاں کو مسہل لینے کا مشورہ دیا جس سے انھیں فائدہ ہوا۔ انھوں نے اس شکریے میں ایک مختصر قطعہ کہہ کر غالبؔ کو بھیجا اور جو آدمی یہ قطعہ لے کر گیا تھا، اسی کے ہاتھ دال اور اچار کا تحفہ بھی بھیجا۔ غالبؔ نے فوراً ایک قطعہ اسی زمین میں کہا۔ اِس میں اس تحفے کی شاعرانہ انداز میں خوب تعریف کی اور تحفہ بھیجنے والے کو دُعائیں دیں اور اپنا قطعہ مرزا ابوالقاسم خاں کو انھیں کے

حاشیہ اگلے صفحہ پر

آدمی کے ہاتھ بھیج دیا۔

اِن دنوں میں کچھ لوگ غالب کے مخالف ہو گئے تھے اور اُن کے کلام پر اعتراضوں کی بوچھار کر رہے تھے۔ خواجہ حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں :۔

"کلکتے کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور اپنے اعتراضوں پر قتیل کا قول سنداً پیش کیا تھا۔ مگر مرزا ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں خسرو کے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے . . . انھوں نے قتیل کا نام سُن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ مَیں دیوالی سنگھ فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا اور اہلِ زبان کے سوا کسی کے قول کو قابلِ استناد نہیں سمجھتا۔ اور اپنے کلام کی سند میں اہلِ زبان کے اقوال پیش کیے۔ اس پر معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضوں کی بوچھار پڑنے لگی۔"

یہی زمانہ تھا جب غالب نے وہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر مرزا ابوالقاسم خاں کو بھیجا تھا۔ اِس لیے کہ انھیں خیال آیا کہ کہیں اس قطعے میں کوئی قابلِ گرفت غلطی نہ ہو گئی ہو

لہ مرزا ابوالقاسم خاں اس طرح کے تحفے اکثر غالب کو بھیجا کرتے تھے۔ غالب نے اپنے کئی خطوں میں ان تحفوں کا ذکر اس طرح کیا ہے :۔

"کلہ پاچہ رسید و کام جاں را بہ تبسم شور انگیز۔ خوباں فرو غلطانید"

"بندہ بخانہ بنودم چوں باز آمدم خوان نعمت آمادہ یافتم و سپاس منعم بجا آوردم"

"نوازش نامہ مع نان خورشہائے رداں پرور و ز آنقہ فراز رسید و بہ سپاس نعمت تر زبان گردانید"

"تفقد رقم نامہ با ثمرہائے خوشگوار رسید۔ ایزد بخانہ ٔ نگر بایں سافر نوازی سلامت دارد"

"بوتل روغن بیدا بخیر سرمایہ روشنی چراغ زندگانی گردید"

اور کہیں وہ مخالفین کے ہاتھ نہ لگ جاتے۔ اس خوف سے انھوں نے اسی دن اسی زمین میں ایک اور قطعہ کہا اور ایک خط کے ساتھ ابوالقاسم خاں کو بھیج دیا۔ اس خط میں لکھا کہ جو قطعہ آج صبح کو مَیں نے آپ کے خط کے جواب میں بھیجا تھا وہ بغیر فکر کی اعانت کے محض قلم کی مدد سے لکھ ڈالا تھا۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آپ کے قطعے کا جواب قرار پاتے۔ وہ تو گویا فقط دال اور اچار کی رسید تھی جو قطعہ اب بھیج رہا ہوں البتہ یہ آپ کے قطعے کا جواب ہے۔ خط اس کتاب کے صفحہ ۱۰۹ پر اور تینوں قطعے (یعنی ایک قطعہ قاسم کا اور دو غالب کے) کتاب کے صفحہ ۱۳۷ - ۱۴۰ پر درج ہیں۔ غالب کے دونوں قطعوں کے باہمی مقابلے سے معلوم ہوگا کہ ان کے فی البدیہہ کلام اور غور و فکر سے انجام دیتے ہوتے کلام میں کیا فرق ہے۔

مرزا احمد بیگ طپاں اور مرزا ابوالقاسم خاں قاسم کی تعریف میں غالب نے ایک اور غزل کہی ہے جو مذکورہ بالا بیاض سے لے کر پیش نظر کتاب میں شامل کی گئی ہے۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے :-

ہم سخن اور ہم زباں، حضرت قاسم و طپاں
اِک طپش کا جانشیں، درد کا یادگار ایک

طپاں اور طپش کے تخلصوں کی مناسبت ظاہر کر رہی ہے کہ طپش کے جانشیں طپاں ہی ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تذکرہ سخن شعرا کی جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے، اس سے معلوم ہو چکا ہے کہ طپاں مرزا جان طپش کے شاگرد تھے۔ اسی تذکرے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طپش خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ اس طرح طپاں کو درد کا یادگار بھی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن منقولہ بالا شعر میں سیاق کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب طپاں کو طپش کا جانشین مان لیا، تو قاسم کو درد کی یادگار ماننا ہوگا، قاسم خواجہ میر درد کے اولاد میں تو تھے نہیں، ان کی شاعری کا سلسلہ درد تک پہنچتا ہوگا۔ مگر یقین کے

ساتھ معلوم نہیں کہ وہ کس کے شاگرد تھے، غالب کی اسی غزل کا ایک شعر یہ ہے :-

دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسول پر فدا
ایک محب چار یار، عاشق ہشت و چار ایک

یہ شعر صاف بتاتا ہے کہ قاسم اور طپاں میں ایک صاحب بارہ اماموں کے ماننے والے یعنی اثنا عشری شیعہ تھے، اور ایک چار یار کے پیرو یعنی اہلِ سنّت تھے۔ غالب نے ایک خط میں قاسم کو سیدالشہدا علیہ السلام کی قسم دی ہے۔ ایک قطعے میں یہ دعائیہ شعر لکھا ہے :-

شاد و خرم بزی کہ در دو جہاں
دستگیر تو سیدالشہدا ست!

اور ایک خط میں یہ عبارت لکھی ہے :-

" دی روز تبرکے کہ فرستادہ بودند رسید و در دو عالم سرفراز گردانید صاحب نذر تا زماں ظہورِ خویشتن سلامت دارد و بہ اعلیٰ مراتب صورت دمعنی رساند۔"

اس عبارت میں قرینہ بتاتا ہے کہ صاحبِ نذر، سے امام مہدی آخرالزماں مُراد ہیں۔ ان سب باتوں سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ قاسم شیعہ تھے۔ اور اگر یہ قیاس صحیح ہے تو غالب کے پیشِ نظر شعر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ طپاں سُنّی تھے۔ بہر حال مذہب کا اختلاف ان لوگوں کے باہمی خلوص میں مخل نہ تھا۔

کلکتے سے واپس آکر غالب نے جو پہلا خط مولوی سراج الدین احمد کو لکھا اس میں اپنے تینوں کلکتوی دوستوں کی جدائی پر بے حد افسوس کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

" و باللہ و اللہ ثم تاللہ کہ رسیدن بہ دہلی ہرگز تلافی اندوہ ہجراں کلکتہ نہ کرد تا بہ شادی چہ رسد۔ بحال تباہے، گرفتارم کہ ہر کہ از اہل نظر را بہ بیند

نماند کہ ایں رہرو بمنزل رسیدہ است، بلکہ پندارد دردمند پست تازہ
از وطن بغربت افتادہ۔ آرے چنیم و چگونہ چنیں نباشدے کہ مولوی
سراج الدین احمد و مرزا احمد بیگ خاں و مرزا ابوالقاسم خاں را از کف
دادہ باشد وائے برمن و روزگار من"

غالب یکم جمادی الثانی روز یکشنبہ کلکتے سے دہلی پہنچے تھے۔ تقریباً ساڑھے تین مہینے کے بعد مولوی سراج الدین احمد کے خط سے مرزا احمد بیگ خاں کے انتقال کی خبر ملی۔ اِس خط کے جواب میں غالب نے بہت تفصیلی خط لکھا۔ اس کا ابتدائی حصہ اور چند متفرق فقرے نقل کیے جاتے ہیں جن سے غالب کے صدمے کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے:

"والا نامہ رسیدہ خبر فراق داتی مرزا احمد رسانید۔ سبحان اللہ چہ مایہ سنگین دل وسخت جانم کہ نامہ در تعزیت مرزا احمد انشا می کنم واجزائے وجودم از ہم نمی ریزد۔ می گفت کہ بہ دہلی می آیم ۔ وعدہ فراموش، بے مروت راہ گرداند و ناقہ بہ سر منزل دیگر راند . . . . وائے بے یاری یاران دے، دریغا بے پدری پسران دے . . . . واللہ کہ غم خواری باز ماندگان احمد بیگ خاں عین فرض و فرض عین است ہم بر شما وہم بر مرزا ابوالقاسم خاں . . . . بہ سامی خدمت مرزا ابوالقاسم صاحب سلامے کہ غم دیدہ بہ غم دیدہ رساند و پیامے کہ ماتم زدہ بہ ماتم زدہ فرستد می تواں رسانید"

اِس بیاض میں غالب کی ایک مثنوی بھی شامل ہے، جو انھوں نے کلکتے کے قیام میں تصنیف کی تھی۔ اس کا سبب تصنیف معترضوں کی وہ یورش تھی جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ کلکتے کے ایک مشاعرے میں غالب نے غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا: جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم

ہمچو موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد

اِس پر کسی نے اعتراض کر دیا کہ 'ہمہ عالم' کی ترکیب غلط ہے اور اپنی تائید میں قتیلؔ کا یہ قول پیش کیا کہ عالم مفرد ہے، اس کا ربط 'ہمہ' کے ساتھ صحیح نہیں۔ اِس اعتراض کے جواب میں غالبؔ نے قتیلؔ کا ذکر تحقیر کے ساتھ کیا۔ یہ بات ایک ادبی معرکے کی بنیاد بن گئی اور کلکتے میں غالبؔ کی مخالف و موافق دو جماعتیں بن گئیں۔ اِس موقع پر غالبؔ نے ایک مثنوی کہی، جس میں اپنے مخالفین سے خطاب کر کے اپنے قیام کلکتہ کی غرض بیان کی، فارسی زبان اور شاعری کے متعلق اپنا مسلک بتایا اور آخر میں ان کی تالیف قلب کی کوشش کی غالب کے مخالفین قتیلؔ کے ماننے والے تھے وہ قتیلؔ کو بہت بڑا شاعر اور فارسی زبان کا سب سے بڑا ماہر سمجھتے تھے ہمارے زمانے میں بھی اس خیال کے بعض لوگ موجود ہیں۔ قتیلؔ کے ہم وطن سید اسد علی انوری فریدآبادی نے اپنی کتاب قتیلؔ اور غالبؔ میں[1] اس امر سے بحث کی ہے کہ غالبؔ نے قتیلؔ کی جو تحقیر کی ہے اور ان کے لیے جو سخت الفاظ استعمال کیے ہیں ان میں وہ حق بجانب نہ تھے اور اپنی فارسی دانی کے متعلق جو دعوے کیے ہیں وہ حقیقت سے دُور ہیں۔ اِس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں :-

> "ہندوستانی فارسی دانوں کا اگر کچھ وقار قائم ہو سکتا ہے تو صرف اس بنا پر کہ کلام فارسی میں ان کی نظر وسیع ہے اور ہر ہر لفظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ اور اس حیثیت سے سچ پوچھیے تو غالبؔ کے مقابلے میں قتیلؔ کا پایہ بہت بلند ہے"

غالب نے قتیلؔ کی جو تحقیر کی تھی وہی قتیلؔ کے عقیدت مندوں کی مخالفت کا خاص سبب تھی۔ اِس لیے غالبؔ نے ان کی خاطر سے اس مثنوی میں قتیلؔ کی تعریف

---

[1] : یہ کتاب جید برقی پریس، دہلی میں ۱۹۳۹ء میں چھپی تھی۔ اس کا ایک نسخہ جناب مصنف کا عنایت کیا ہوا میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

بھی کر دی ۔ مگر اس میں اتنا مبالغہ کیا کہ وہ تعریف ، ہجو ملیح بن گئی ۔ یہ مثنوی غالبؔ کے کلیات نظم میں بادِ مخالف کے نام سے شامل ہے ۔ مگر اس میں کہیں کہیں لفظی ترمیم کر دی گئی ہے ، کہیں کوئی شعر کہیں کئی شعر گھٹا یا بڑھا دیئے گئے ہیں ، اور کہیں شعروں کی ترتیب بدل دی گئی ہے ۔ مثنوی کے ابتدائی حصے میں یہ تغیرات کم ملتے ہیں ، مگر جتنا آگے بڑھیے ، تبدیلیاں زیادہ ہو جاتی ہیں اور آخر کے قریب ایک حصہ تو گویا بالکل بدل گیا ہے ۔ اس بیاض میں اس کی وہی شکل ہے جس میں وہ کلکتے والوں کے سامنے پیش کی گئی تھی ۔ اس لیے وہ مثنوی بھی اس کتاب میں شامل کر لی گئی ہے ۔ مثنوی کی کتابت اس طریقے سے کی گئی ہے کہ اس کی ابتدائی صورت کے ساتھ وہ صورت بھی سامنے آجاتی ہے جس میں اس کو نظر ثانی کے بعد غالب نے اپنے فارسی کلیات میں درج کیا ہے ۔

اس طریقے کی وضاحت صہ۱۴۲ پر مثنوی کی ابتدا میں کر دی گئی ہے ۔

غالبؔ اپنے ایک خط میں ، جو چودھری عبدالغفور کے نام ہے اس مثنوی کے متعلق لکھتے ہیں :-

" یہ مثنوی جس میں یہ مصرع ہے " حاش للہ کہ بدنمی گویم ، کلکتے میں میں نے لکھی ہے ۔ پانچ ہزار آدمی فراہم تھے اور جو اعتراض مجھ پر کیے تھے ان میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ 'ہمہ عالم' غلط ہے ۔ یعنی 'ہمہ' کا لفظ 'عالم' کے ساتھ ربط نہیں پا سکتا ، قتیل کا حکم یوں ہے ۔ عرض کیا گیا کہ حافظ کہتا ہے ' ہمہ عالم گواہ عصمت اوست ، سعدی کہتا ہے 'عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از دست ' ۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ مثنوی وہاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رام پوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال اور نظائر

کے پاس بھیجی گئی۔ اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کھال ادھیڑ ڈالتے۔[1]

میرے کتب خانے میں انشائے طاہر وحید کا ایک پرانا قلمی نسخہ ہے، اس کے شروع میں دو سادے ورق تھے، جن پر غالب کا ایک طولانی خط شیخ ناسخ کے نام کسی نے نقل کر لیا تھا اور اس پر یہ عبارت لکھ دی تھی :-

"نقل خط مرزا اسد اللہ خاں غالب کہ بہ شیخ ناسخ مرحوم نوشتہ بودند"

اِس خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی مالی پریشانیوں کا حال سُن کر شیخ ناسخ نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ دکن چلے جائیں، جہاں مہاراجہ چندو لال کی فیاضیاں اُن کو آسودہ حال بنا سکتی تھیں۔ اس خط کے جواب میں غالب نے یہ خط ناسخ کو لکھا تھا۔ اس خط کے آخری حصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتیل سے غالب کو اتنی نفرت تھی کہ جو شخص قتیل کو اُستاد سمجھتا ہو اس کی قدردانی اور سرپرستی کو بھی وہ اپنے لیے ننگ سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں وہ قتیل سے بیزار تھے وہاں شاہ نصیر کی شاعری کے بھی قائل نہ تھے۔ اس خط کو نقل کرنے والے کی بدخطی اور کیڑوں کی گُل کاری نے مل کر اس کا پڑھنا ایک مشکل کام بنا دیا ہے۔ بہت غور کرنے کے بعد بھی بعض لفظوں میں شک باقی رہ گیا۔ یہ خط اس کتاب کے صفحے ۱۲۸ پر نقل کیا گیا ہے۔

غالب کے شاگرد منشی ولایت علی صفی پوری نے، جن کا نام اور تخلص بعد کو عزیز اللہ شاہ عزیز ہو گیا، اپنی تصنیف گنج رقعہ کا ایک نسخہ اپنے استاد کی خدمت میں بھیجا۔ اس کی رسید میں غالب نے ان کو جو خط لکھا وہ بھی اس مجموعے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاگردی اور اپنے نام اور تخلص کی تبدیلی کا حال جو خود لکھا ہے وہ ضمیمہ کتاب میں درج کر دیا گیا ہے۔

---

[1] ادبی خطوط غالب ۱۹۳۶ء ص ۱۸۔ ۱۹

غالب کا ایک خط اور غالب کے نام دو خطوط

غالبؔ کا خط اُن کے شاگرد سید احمد حسین مینکشؔ کے نام ہے اور غالبؔ کے نام ہے دونوں خط منشی یحییٰ خاں کے ہیں۔ یہ تینوں خط غیر مطبوعہ ہیں۔ غالبؔ کے مجموعۂ خطوط عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ میں مینکشؔ کے نام کوئی خط نہیں، اور پنج آہنگ میں مینکشؔ کے نام صرف ایک خط ہے۔ احسان اللہ خاں ممتازؔ کی فارسی بحر مواج۔ انبیاء و مرسلین کے حالات میں ہے۔ اس کو شیخ عبداللہ نے اپنے مقدمے کے ساتھ ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۳ء) میں شائع کیا۔

منشی یحییٰ علی خاں نے ایک کشکول میں اپنی اور اپنے چھوٹے بھائی منشی باقر علی خاں کی متعدد تحریریں اور نظمیں درج کر کے اپنے ہاتھ سے خط شفیعا میں لکھا۔ کشکول کے سرورق کی عبارت یہ ہے۔

"نقل بعضے از نگارشات منشی محمد یحییٰ علی خاں ولد میر منشی ثابت علیخاں بہادر ابن امین الانشاء۔ رونق علی خاں مرحوم ابن منشی فیض محمد پالکی یاب و جاگیردار عہد نواب آصف جاہ بہادر۔"

یہ کشکول اور مثنوی بحر مواج کا مقدمہ زیر قلم مضمون کے دو معتبر ماخذ ہیں۔

ملک الشعراء میر قمر الدین منّتؔ کے شاگرد ممتاز الشعراء مولوی شیخ احسان اللہ خاں ممتازؔ اناؤ کے رہنے والے اپنے زمانے میں فارسی کے بڑے نامی نثار اور شاعر تھے۔ ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوتے اور ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۷ء) میں ستانوے برس کی طویل عمر میں

انتقال کیا۔ وہ اودھ کے فرماں روا نواب سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ میں مقیم اور معزز عہدوں پر فائز رہے۔ پہلے مفتی اور پھر عمدۃ الاقتدار اور داروغہ عدالت فوجداری مقرر ہوتے۔ ان کے شاگردوں میں ملاّ نواں ضلع اناؤ کے رہنے والے دو بھائی منشی یحییٰ علی خاں یحییٰ اور منشی باقر علی خاں باقر بھی تھے[۱]۔ فارسی انشا پردازی ان کا آبائی امتیاز تھا۔ منشی یحییٰ علی خاں لکھنؤ میں داروغہ اخبار گشتی تھے۔ ان کے بیٹے منشی ولایت علی ولایت درویشی اختیار کر کے صفی پور ضلع اناؤ میں مقیم ہو گئے۔ ان کے مُرشد نے اُن کو محمد عزیز اللہ شاہ، کا لقب عطا کیا۔ اس کے بعد وہ عزیز بھی تخلص کرنے لگے۔ فارسی کے زبردست شاعر اور نثّار تھے۔ اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ نثر و نظم میں پینتیس ۳۵ کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ ان سے اور مرزا غالب سے خط و کتابت ہوتی تھی اور غالب ان کی فارسی دانی پر فخر کرتے تھے۔ راقم الحروف نے اپنے لڑکپن میں ایک بزرگ سے سُنا تھا کہ غالب نے ایک خط میں منشی ولایت علی کو لکھا تھا کہ یہاں مَیں غالب اور وہاں تم غالب۔

منشی یحییٰ علی خاں کے چھوٹے بھائی منشی محمد باقر علی خاں باقر فارسی نثر و نظم میں بڑے بھائی سے بھی زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ نثر نگاری میں بالخصوص ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔

"اعیان شہر اتفاق داشتند کہ مثل باقر علی خاں نثارے دیگر در لکھنؤ نیست"۔

اُنھوں نے چوبیس ۲۴ کتابیں نثر میں لکھیں، جن میں صرف دو یعنی شعلہ جانسوز اور

---

[۱] : منشی یحییٰ علی خاں، اُن کے بھائی منشی باقر علی خاں اور بیٹے منشی ولایت علی ولایت عرف عزیز اللہ عزیز کے حالات کے لیے دیکھیے عیار غالب مرتبہ مالک رام میں راقم کا مقالہ خطوط مشاہیر بنام ولایت دعزیز صفی پوری شاگرد غالب؛

مرأۃ الجمال چھپ کر شائع ہوئیں۔ شاعر ایرانی مرزا ناطق مکرانی ان کی مدح میں لکھتا ہے :-

در نظم توی فیضی ثانی باقر　　در نثر ابوالفضل زمانی باقر
کس نیست چو تو بہ نکتہ دانی باقر　　در ہند کہ جاوید بمانی باقر

منشی یحییٰ علی خاں کے کشکول میں مرزا غالب کے ایک خط کا اقتباس بھی درج ہے۔ یہ خط احمد حسین خاں میکش کے نام اور اُس کا یہ اقتباس منشی یحییٰ علی خاں سے متعلق ہے اِس اقتباس کے عنوان کی عبارت یہ ہے :-

"فقراتے کہ جناب مرزا محمد اسد اللہ خاں غالب شاہ جہاں آبادی در ضمن خط اسمی شاگرد رشید خود احمد حسین خاں میکش تحریر نمودہ اند"

اور اقتباس حسب ذیل ہے :-

"آنچہ از مہرورزی (کذا) و مہربانی منشی محمد یحییٰ علی خاں صاحب نسبت خویشتن رقم کردہ اند۔ محبت آں فرخندہ گہر در دلم جا کرد آں کہ شمارا چوں من عزیز دارد من چوں عزیزش ندارم۔ شفقتے کہ برشما می کنند منتے است کہ برمن می نہند۔ و چوں نوشتہ اند کہ یحییٰ تخلص می کنند و سخن می گویند۔ سلام من بایشان و کلام ایشان بمن باید رسانید"

جواب از محمد یحییٰ علی عفی اللہ عنہ؛

(آپ نے جو اپنی نسبت منشی محمد یحییٰ علی خاں کی مہرورزی اور مہربانی کا حال لکھا ہے اس سے اس فرخندہ گہر کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ جو آپ کو میری طرح عزیز رکھے بھلا اسے میں کیونکر نہ عزیز رکھوں۔ جو شفقت وہ آپ پر فرماتے ہیں دراصل احسان ہے جو وہ مجھ پر کرتے ہیں۔ اور چونکہ آپ نے لکھا ہے کہ وہ یحییٰ تخلص کرتے ہیں اس لیے میرا اسلام اُن

گو اور اُن کا کلام مجھ کو پہنچے)۔

نواب عالی جناب فیض رسانا۔ از روزے کہ بہ ملاقات جناب میر احمد حسین خاں میکش مسرور شدہ ام وکیفیت بری دارم قلم کم وکیف آں نمی تواند نگاشت واز بلند رتبگی جناب والتے واشیتم اگر از اشتیاق آستانہ فیض کاشانہ حرفے زنم حد خود نمی بینم کہ بر کدام امر این آرزوہا تواں نمود کہ خلق خلقی والا دست الطاف وکرم برسرم نہاد وسیر مارا از منت باخم کرد وزاید مشتاقِ لقائے مُبارک ساخت ۔ اگر عاری نویسم از ناداشتن عار بر دارم واگر بہ رنگین رنگین طرازی سازم رنگ ارژنگ نہ دارد آخر رنگ برو شکنم۔ واگر بہ نظم سخنے منتظم کنم این کلام ست ناموزون و دال بر زبونی این زبون۔ پس کدام لفظ ومعانی پیدا کنم کہ شائستہ مدح و ثنائے والای آید وشکر گزاری واشتیاق غائبانہ عرض نماید۔

ایں طرفہ گلے نگر کہ مارا بشگفت ،
نے رنگ تواں نمود ونے بوئے نہفت

ایں قدر گستاخی می نماید کہ کارِ دل از دستِ اشتیاق خراب است و دیدۂ دیدار طلب پُر آب۔ الا بہر کیف چوں از آں سو دلدار پیدا شدہ است ختم کلام برآیں معنی است ۔

اسد اللہ اسد گر بہ مددگاریِ دِل
زہرۂ شیر بود آب زپاداریِ دِل

وچوں از کلام موزوں طبعانِ شب را بہ روز آوردہ ام از تاثیرش گاہ بے نعرہ موزدن کردم ودلا ۔

شاعری فنِ شریف است ولا کارِ تو نیست

دخان ممدوح اینچہ نوشتہ خوبی محمود کردہ و بندہ را شرمندہ۔ نیک چوں
خود نیک داند جملہ را۔

نواب عالی جناب فیض رسانا۔

جس دن سے مجھے جناب میر احمد حسین خاں میکش سے ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی ہے، اس دن سے میری جو کیفیت ہے قلم اس کے کیف وکم کو لکھ نہیں سکتا۔ جناب کی بلند رتبگی کے سامنے اپنے اشتیاق ملاقات کا اظہار کرتے نہیں بنتا تھا کہ کس بساط پر ایسی آرزوئیں زبان پر لائی جائیں، ایسے میں آپ نے اپنے فطری خلق و مروّت سے کام لے کر میرے سر پر دستِ کرم رکھا اور اس احسان سے میرا سر خم اور مجھے پہلے سے زیادہ مشتاقِ ملاقات کردیا۔ اگر نثرِ عاری لکھنے بیٹھوں تو اپنی ناواقفیت سے عار ہے۔ اگر نثرِ رنگین میں رنگین طرازی کروں تو اس میں بھی کوئی رنگا رنگی نہیں۔ اور اگر نظم میں سخن کو منظم کروں تو یہ بھی ناموزوں بات اور مجھ زبوں کی زبونی پر دال ہے۔ پھر کون سے لفظ و معنی پیدا کروں جو آپ کی مدح و ثنا کے شایان ہوں اور شکر گزاری اور اشتیاقِ غائبانہ کا اظہار کرسکیں

ایں طرفہ گلے نگر کہ مارا بشگفت
نے رنگ توان نمود و نے بو بنہفت

البتہ اتنا گستاخانہ عرض کرتا ہوں کہ اشتیاق کے ہاتھوں دل کا حال خراب اور دیدۂ دیدار طلب پُر آب ہے۔ بہر کیف چونکہ آپ کی جانب سے دلداری ہوتی ہے۔ لہٰذا ختم کلام اس طور پر ہے:

اسد اللہ اسد گر بہ مددگاری دِل
زہرۂ شیر بود آب ز پاداری دِل

اور چونکہ موزوں طبعوں کا کلام پڑھ پڑھ کر رات کو دن کیا کرتا ہوں اس لیے اسی کی تاثیر سے کبھی کبھی کوئی نعرہ موزوں کرلیا ہے ورنہ

شاعری فنِ شریف است ولا کار توفیت

اور خانِ ممدوح نے جو کچھ لکھا اس سے ان کی خوبی ظاہر اور بندے کو شرمندگی حاصل ہوتی : نیک چون خود نیک داند جملہ را ۔

یہ خط لکھنے کے کچھ مدت بعد منشی یحییٰ علی خاں نے غالب کو دوسرا خط لکھا ۔

رقعۂ ثانیہ بنام اسداللہ خاں غالب

نواب عالی جناب فیض رساننا۔ سر بر تسلیم خم است چنانکہ دل ہمچو قبلہ نما بہ رجوعِ قبلہ ہمدم۔ دگر مدت دو سال سر آمد کہ نامۂ موعودِ میر احمد حسین بر سرم نرسید و سرم واز سراسیمگی نزدیک بندہ نیز در تفتیش بیمار گردیدم و بہ مقام تارِ بسترِ رسیدم۔ ہر کہ دید نشناخت و ہر کہ شنید دل باخت و توقع برداشت حالانکہ قدر از دستِ قضا باز ستانید و عمر دوبارہ یافتیم و توان در جان دروان آمد نفرۂ اوّل کہ زدم با دوست بود کہ در دیدہ و دل ہمہ اوست بود۔ لراقمہ

در دل و دیدہ کردہ ای منزل از تو جاناست دردِ جاں حاصل

ذکر احمد حسین برلب ماست فکر تو نیز با دلم واصل !

ملمذا ذرہ را پرتوِ آفتاب ذریعہ و قطرہ را موجِ دریا وسیلہ و آن پرتو و موج نیز از جانب جناب میر احمد حسین بودہ است کہ رُخ بہ ما گردیدہ و بر ساختِ دلم تابیدہ و الّا بہ کدام سرمایہ ہمدستان توان شد و یا دِ خود را بجائے خود بر آن آستان توان جا داد۔ الغرض چنانکہ حضرتِ شان باعثِ پرسش و افتخار ما از جانب غالب کل غالب شدہ بود حالا ہم پرسش او سبب اعتبار من و تحریک خامۂ مشکیں شمامہ شود عجبے نیست بل بزرگانِ اعتبار بخشند و از آن خود نگرند نیز گنجائش ہا دارد و الّا رائے ایں آرزو نیم

ظاہر است کہ بہ کدام لیاقت وقابلیت خود را زیبائے ایں معنی تواں دید۔
ہاں مگر لطفِ شما پیش نہد گامے چند

باقر باقر اگر زندہ می بود سزا دارِ بندہ می بود۔ کلام ماباں را میر احمد حسین رسانیدہ باشد و مشمول رائے گردانیدہ۔ دگر از مولانا فخرالدین خوشنویسِ خطِ شکستہ کہ شکست بہ دلم غائبانہ رسانیدہ و درمیانش رابطِ خط واسطہ نیز استفسارے است اگرچہ پیشِ پرسشِ میر احمد حسین گنجائش دگر در نظر نیست لیکن چوں جلوہ گاہِ دوست است ہمہ اوست است۔ اے یحیٰ زنہار زنہار خبردار و شرطِ ادب نگہ دار۔ زیادہ از حد خود مگو و راہ بیہدہ مرو و بدیں اکتفا است۔

کردم از عقل سوالے کہ بگو ایماں چیست
عقل در گوشِ دلم خواند کہ ایماں ادب است

و از آں سو ہمیں زیباست
لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

والسلام مع الاکرام۔
نواب عالی جناب فیض رسانا۔

سرِ تسلیم کے واسطے خم ہے جیسے دل قبلہ نما کی طرح آپ کی طرف رجوع کیے ہوتے ہے دو سال کی مدت ہو گئی کہ میر احمد حسین کا موعودہ خط مجھے نہیں ملا اور مجھے اس کی خواہش کے سوا اپنی خبر نہیں۔ یہ بات ان کے اخلاق سے بعید ہے اور اسی وجہ سے میں سراسیمگی کے نزدیک آپہنچا ہوں۔ میں بھی ان کی غیر موجودگی میں بیمار پڑا اور تا دیر بستر ہو کر رہ گیا۔ جس نے دیکھا وہ پہچان نہ سکا، جس نے سُنا وہ گھبرا گیا اور اُمید چھوڑ بیٹھا۔ اب جب کہ قسمت مجھے قضا کے ہاتھوں سے نکال لائی اور مَیں نے دوبارہ زندگی پائی اور جان میں

جان آئی تو پہلا نعرہ جو میں نے مارا وہ دوست کے لیے تھا کہ دیدہ و دل میں وہی وہ تھا :

در دل و دیدہ کردہ ای منزل ‏ ‏ ‏ از تو جاناست درد جان حاصل
ذکر احمد حسین برلب ماست ‏ ‏ ‏ فکر تو نیز با دلم واصل!

معہٰذا ذرّے کے لیے پرتوِ آفتاب ذریعہ اور قطرے کے لیے تموّجِ دریا وسیلہ ہے اور یہ پرتو و موج کا وسیلہ بھی مجھے جناب میر احمد حسین کی بدولت حاصل ہوا ورنہ میرا کیا مقدور تھا کہ آپ سے ہم کلام ہوتا اور آپ کو اپنی یاد دلاتا۔ الغرض جس طرح ان کی ذات غالب کل غالب کی جانب سے میری پرسش کا باعث ہوتی تھی اسی طرح اُن کی پرسش اگر مجھے شرف اعتبار بخشے اور آپ کے خامۂ مشکیں شمامہ کو تحریک دے تو کوئی عجیب بات نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ بزرگوں نے خُردوں کا اعتبار بڑھا دیا ہے۔ اگر آپ از خود مجھے اپنی توجہ سے ممتاز فرمائیں اور اپنا جانیں تو خیر ورنہ ظاہر ہے کہ میں ایسی آرزو کی ہمت کہاں کر سکتا ہوں اور کس لیاقت و قابلیت کے بھروسے پر خود کو اس عنایت کا مستحق سمجھ سکتا ہوں :

ہاں مگر لطفِ شما پیش نہد گامے چند

باقر باقر اگر زندہ ہوتا تو سزاوارِ بندہ ہوتا۔ میرا کلام میر احمد حسین کے ملاحظے سے گزرا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ مولانا فخر الدین جو خطِ شکستہ کے خوش نویس ہیں اور جنھوں نے غائبانہ میرے دل کو شکست پہنچائی ہے۔ ان کے متعلق بھی پوچھنا ہے۔ اگرچہ میر احمد حسین کی پرسش کے سامنے کسی دوسرے کی گنجائش نہیں لیکن چونکہ دوست کی درگاہ ہے اس لیے ہمہ دست کا عالم ہے۔ اے یحییٰ زنہار زنہار، خبردار، شرطِ ادب ملحوظ رکھ، اپنی حد سے بڑھ کر نہ بول اور بے راہ مت ہو۔ بس اسی پر اکتفا ہے :

کردم از عقل سوالے کہ بگو ایماں چیست ‏ ‏ ‏ عقل در گوش دلم گفت کہ ایماں ادب است

اور اُدھر سے یہی مناسب ہے :

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

(والسلام مع الاکرام)

ان خطوں کی تاریخ تحریر معلوم نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ منشی یحییٰ علی خاں نے ان کو اپنے کشکول میں ۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ کو نقل کیا تھا۔

غالب کے ایک قصیدے پر واجد علی شاہ کا عطیہ

دربار اودھ سے مرزا غالب کے تعلقات کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔ یہ تعلقات اودھ کے آخری فرماں روا سلطان عالم واجد علی شاہ کے آخری عہد تک باقی تھے غالب صاحب عالم مارہروی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

" واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری ۵۰۰ روپے سال مقرر ہوتے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔"

یوسف مرزا کے نام ایک خط میں لکھتے :

" مَیں چودہ پارچے کا خلعت ایک بار اور جیغہ و سرپیچ جواہر مع مالائے مروارید ایک بار پیش گاہ حضرت سلطان عالم سے پا چکا ہوں۔ مگر یہ بھی جانتے ہو کہ وہ خلعت مجھ کو دو بار کس کے ذریعے سے ملا ہے، یعنی جناب قبلہ وکعبہ مجتہد العصر مدظلہ العالی۔"

جناب قبلہ وکعبہ مجتہد العصر سے غالب کی مراد ہیں۔ سلطان العلما سید محمد صاحب قبلہ۔ سلطان العلماء کے ابن عم زبدۃ العلما سید علی نقی صاحب کی یادداشتوں کی ایک کتاب لکھنؤ میں حکیم سید علی آشفتہ مرحوم کے پاس تھی جس سے راقم الحروف نے چند تحریریں نقل کرکے رکھ لی تھیں۔ جن کاغذوں پر یہ تحریریں تھیں وہ دوسرے کاغذوں

میں مخلوط ہو کر نگاہ سے اوجھل ہو گئے - ایک مدت کے بعد پرانے کاغذوں کے اُلٹ پلٹ کرنے میں ان کاغذوں پر نظر پڑی- اِس مدت میں یہ کاغذ دو جگہ سے کرم خوردہ ہو گئے، جس کی وجہ سے دو تین لفظ پڑھے نہیں جا سکے- اِن کاغذوں میں سے تین تحریریں اس وقت پیش کی جا رہی ہیں یعنی

۱. حکم نامہ سلطان عالم واجد علی شاہ بنام خاندان شاہی
۲. سفارش نامہ سلطان العلماء بخدمت سلطان عالم
۳. مکتوب سلطان العلماء بنام مرزا غالبؔ۔

اِن تحریروں سے غالبؔ کے ایک قصیدے کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کب اور کس موقعے پر حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور بادشاہ نے غالبؔ کو کیا صلہ عطا فرمایا۔

کربلائے معلیٰ سے امام حسین علیہ السلام کی خاک شفا کی ضریح واجد علی شاہ کے لیے بھیجی گئی- سلطان العلماء مجتہد العصر نے بادشاہ کو اس کی اطلاع دی بادشاہ نے شاہی خاندان کے لوگوں کے نام ایک حکم نامہ جاری کیا جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :-

" دریں ولا حسب ایما واجازت مولائے جہان وجہانیان حضرت ابا عبداللہ الحسین شہید معین مظلومان کہ بہ مجتہد نجف اشرف شدہ از ان جا معرفت سلطان العلماء مجتہد العصر والزمان بہ داعی دولت حضرت صاحب الزماں رسیدہ . . . . بہ سبب عارضہ خفقان اختیار پیادہ روی نمی دارد۔ لہٰذا نور چشم ایں دودمان برخوردار صاحب عالم وعالمیان مرزا ولی عہد بہادر و برخوردار جرنیل صاحب بہادر و دیگر شاہزادگان ایں خاندان حکم دادہ کہ بنیابتہ بہ استقبال پردازند وایشاں ہم شریک استقبال شدہ تا بہ خانہ رسانند۔ عنداللہ ماجور خواہند شد بتاریخ ۲۶ ر

شعبان ۱۲۷۰ھ یوم پنجشنبہ یک دہم پاس روز باقی ماندہ سیاہ پوش شدہ بہ کربلائے دیانت الدولہ بہادر حاضر شوند"

اِس ضریح کے ورود کا حال سُن کر غالبؔ نے ایک قصیدہ سلطان العلماء کو بھیجا جس کا مطلع یہ ہے سے

بیا در کربلا تا آں ستم کش کارواں بینی　　کہ دردے آدم آل عبا را ساربان بینی

سلطان العلماء نے یہ قصیدہ اپنے سفارش نامے کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا۔ سفارش نامہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :۔

"سلطان العلماء۔ خلد اللہ ملکہ : ازاں جا کہ آوازۂ وصول بشارت موصول ضریح مبارک خاک شفا از کربلائے معلیٰ برائے بندگان اقدس و اعلیٰ ازیں بیت السلطنت، ہمیشہ آباد تا دار الخلافت شاہ جہان آباد رسیدہ اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی کہ در فن شعر و سخن یکتا و در فصاحت نظم و نثر بے ہمتا و مانند نظیری نظیرے ندارد و اگر کلامش مقبول بارگاہِ خاقانی شود ہم پایۂ خاقانی باشد، درین ولا قصیدۂ غرا در مدح ضریح بطرز ملیح و بیان فصیح انشا نمودہ و جادۂ مدحت گری و ثنا گستری بندگان سکندر شان را بہ قدم اقدام پیمودہ بہ مفادِ

تَمَلَّتُ جَاءَ تَتِیہ حَلِ مِنُ جُرادِ

تو سلیمانی کن اے عالی نژاد

بطریق . . . . کہ بعد قبول تحفۂ موفرہ می گردد۔ بحضور معلیٰ گزرانیدہ لہٰذا داعی کہ در امور خیر ساعی می باشد بہ بارگاہ فلک جاہ آن را ارسال داشتہ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ و چوں متضمن مرثیہ و اشعار مبکیہ است، غالبؔ کہ بہ موداۓ فقرۂ شریفہ کہ در حدیث ثواب بکا و باکی وارد گشتہ

غفراللہ ذنوبہ ولو کانت مثل۔
باعث عفو و غفران لغزش قدم و لرزش قلم کہ در مثنوی[1] سابق لاحق حالش شدہ بود گردد۔ رجاے واثق کہ ہموارہ مادح ممدوح مورد مراحم سلطانیہ و عنایات خاقانیہ از پیش گاہِ بارگاہ جم جاہ بودہ باشد۔ دائما خورشید معدلت گستری از مطلع عنایت خسروی طالع و لامع باد۔"

سلطان العلماء کی سفارش پر بادشاہ نے غالبؔ کو خلعت فاخرہ عطا کیا۔ لیکن سلطان العلماء کو خیال ہوا کہ دہلی کے بادشاہ اور شاہی خاندان سے غالبؔ کے تعلقات ہیں، کہیں اِس عطیے کا بھیجنا بادشاہ دہلی کے مزاج کے خلاف نہ ہو اور یہ بات غالبؔ کے مقررہ وظیفے کی برہمی کا باعث نہ بن جائے۔ اس خیال سے انھوں نے اس معاملے میں توقف کیا اور غالبؔ کو لکھا کہ اب آپ جو مشورہ دیں اُس پر عمل کیا جائے۔ اِس مضمون کا خط جو سلطان العلماء نے غالبؔ کے نام بھیجا تھا وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

"مشہود خاطر تودد مآثر باد کہ پیشتر در پاسخ نمیقۂ انیقہ مکتوب مشعر بر ایصال معروضہ مع قصیدۂ فریدہ بہ پیش گاہ سلطانی نوشتہ ارسال داشتہ ام۔ مظنۂ ایست کہ بر نظر شریف رسیدہ باشد و دیگر پاسخش ہنوز نہ رسیدہ۔ بالفعل امر تازہ کہ قابل اظہار است ایں کہ قصیدہ موصوفہ کہ متضمن ذر رعز رآبدار و لاآلی متلالی شاہوار بود خیلے پسند خاطر مبارک بندگان والا دربان افتاد۔ تشریف قبول بر نہج معمول . . . . بہ اعطاے ارسال خلعت فاخرہ از بارگاہِ سپہر اشتباہ صادر۔ امابخیال ایں کہ آں ناظورۂ بوستاں

---

[1] دیکھیے نگارشات ادیب میں راقم کا مضمون "مرزا غالب کی ایک ہنگامہ خیز مثنوی"۔

سخن دانی باہمہ دودمان صاحب قرانی دربیت اورنگ گورگانی تعلق وتوسلے دارند مبادا ابلاغ ایں عطیہ شریفہ مخالف مزاج آں بادشاہ جم جاہ وباعث برہمی وظیفہ مقررۂ سامی شود لہٰذا دریں باب توقف نمودہ شد۔ الحال انچہ مشورۂ سامی گرامی باشد بہ عمل آید۔ یوم الاحد الرابع من شہر ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ۔

اصل خط کے لفافے پر حسب ذیل عبارت تھی :۔

"بعونہٖ وصونہٖ تعالیٰ درشاہ جہان آباد صینت عن الفساد بہ انامل سعادت شمائل خان صاحب والا مناقب عالی مناصب فارس میادین سخنوری ماحی کارنامۂ خاقانی وانوری نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان غالب بہادر نظام جنگ زاد مدارجہ، وعلا معارجہ مفتوح باد۔"

مرزا غالب تب اور اب

غالبؔ کی شاعری میں مضامین نئے تھے، زبان نئی تھی، لہجہ نیا تھا۔ مضامین نئے ہونے کے ساتھ مشکل بھی تھے۔ معمولی آدمیوں کا ذکر نہیں، کاملانِ سخن ور بھی آسان کہنے کی فرمائش کرتے تھے جیسا کہ غالبؔ نے خود کہا ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل   سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل!

اِن مشکلات کا نتیجہ یہ ہُوا کہ لوگ غالبؔ کو مہمل گو کہنے لگے یعنی یہ کہ ان کے شعر بے معنی ہوتے ہیں۔ ان کے ایک ہم عصر نے صاف کہہ دیا۔

کلام میرؔ سمجھے اور کلام میرزا سمجھے   مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالبؔ نے اِن معترضوں کے جواب میں کبھی کہا

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

کبھی کہا

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے   خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کبھی اس صورتِ حال پر یوں افسوس کیا

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ   دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

کبھی اِس فطری خواہش کا اظہار کیا کہ کاش کوئی میری زبان سمجھنے والا مل جاتا۔

بیا در دیدگر ایں جا بود زباں دانے　　　غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

کبھی مایوس ہو کر کہا۔

"حیف کہ ابنائے روزگار سخن گفتارمرا نہ شناختند۔۔۔۔ وازیں نمائش ہائے نظر فروز کہ درنظم و نثر بکار بردہ ام سرگراں گزشتند" (قاطع برہان منشی)

غالبؔ کا کلام مشکل اب بھی ہے۔ اس کی دو درجن شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور اب بھی لکھی جا رہی ہیں۔ مگر اب تک بعض شعروں کا مطلب حل نہیں ہوا۔ لیکن اب اگر غالبؔ کا کچھ کلام ہماری سمجھ میں نہیں آتا تو ہم غالب کو مشکل گوئی کا الزام نہیں دیتے بلکہ اپنے ذہن کی نارسائی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔

بڑی عجیب بات یہ ہے کہ جس کلام کو پورے طور پر سمجھ لینا اردو کے اچھے اچھے ادیبوں کے امکان میں نہیں ہے وہ ہندی والوں میں اتنا مقبول ہے کہ دیوناگری رسم خط میں ہزاروں کی تعداد میں چھپتا ہے اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے، حالانکہ ناگری رسم خط میں غالبؔ کے اشعار کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے۔ مثلاً غالب کا مصرعہ

'عرض نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا'

ناگری میں

'ارجے نیاجے اِشک کے کابل نہیں رہا'

غالب کے کلام کا کیا ذکر غالبؔ کا نام بھی ناگری خط میں صحیح نہیں لکھا جا سکتا اور ہندی کے مستند عالم تک مرزا غالبؔ کو 'مرجا گالب' کہنے لگے ہیں۔ اِن حالات میں ناگری تحریر میں غالب کی اتنی مقبولیت دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ تائیدِ غیبی غالبؔ کے شاملِ حال ہے۔

شمس العلماء آزاد غالبؔ کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں یوں لاتے ہیں:

"غالبؔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گُنگ کر دیئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔"

اب یہ بات غالبؔ کے کلام پر پورے طور پر صادق آتی ہے کہ سمجھیں یا نہ سمجھیں تعریف سب کرتے ہیں۔

غالبؔ کے عہد میں بلکہ اس کے بعد ایک مدت تک پورا شاعر وہی سمجھا جاتا تھا جس کا کلام مقدار میں کافی ہو اور صاحبِ دیوان ہو۔ اور دیوان اس مجموعہ غزلیات کو کہتے ہیں جس میں الف سے ی تک تمام ردیفوں میں غزلیں موجود ہوں۔ غالبؔ کا مجموعۂ اشعار مقدار میں تمام نامی شاعروں کے کلام سے بہت کم ہے۔ اس میں تمام ردیفوں میں غزلیں بھی نہیں ہیں۔ مکمل غزل میں مطلع، مقطع اور کم سے کم پانچ سات شعر ضرور ہونا چاہیئے۔ مگر غالبؔ کی غزلوں کا یہ حال ہے کہ کسی غزل میں مطلع ہے تو مقطع نہیں ہے، کسی میں مقطع ہے تو مطلع نہیں ہے، کسی غزل میں صرف دو شعر ہیں، کسی میں تین۔ مکمل غزلیں تھوڑی سی ہیں۔ یعنی دیوان کی ستر تعریف کے مطابق غالبؔ کے مجموعۂ اشعار کو دیوان اور غالبؔ کو صاحبِ دیوان نہیں کہہ سکتے۔ غالبؔ کے کسی ہم عصر نے اس صورت حال پر یوں طنز کیا ہے ؎

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالبؔ آسان نہیں صاحبِ دیوان ہونا

اور غالب نے اس کے جواب میں کہا ہے:

نیست نقصاں یک دو جزو است ار سواد ریختہ
کاں وژرم برگے ز نخلستانِ فرہنگ من است

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

یعنی میرا اُردو کلام صرف ایک دو جزو ہے تو کیا نقصان ہے۔ وہ تو ایک بے رنگ مجموعہ ہے۔ اس کو ہٹاؤ اور میرا فارسی کلام دیکھو کہ اس میں رنگ رنگ کے نقش دکھائی دیں گے۔

لیکن آج اُسی ایک دو جز کے بے رنگ مجموعۂ اُردو کو ہم اپنے گلے کی حمائل بنائے ہوتے ہیں اور اس کو بڑے بڑے ضخیم دیوانوں سے زیادہ وزنی سمجھتے ہیں۔

آج سے ساٹھ ستر برس پہلے ایسے عالم و فاضل دیرینہ سال بزرگ اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے جو شعر کا ذوق رکھتے تھے، میرؔ اور انیسؔ کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے تھے۔ مگر غالبؔ کی شاعری کے بالکل قائل نہ تھے۔ وہ اچھا شعر اس کو سمجھتے تھے جو کان میں پڑتے ہی دل میں اُتر جائے، جس کو سمجھنے کے لیے لغتوں اور شرحوں کی ضرورت نہ پڑے۔ وہ شعر میں مضمون کی ندرت سے زیادہ بیان کی نفاست پر نظر رکھتے تھے۔ غالبؔ کا کلام ان کے معیار پر پورا نہ اُترتا تھا۔ اِس لیے وہ غالبؔ کا شمار اچھے شاعروں میں نہ کر سکتے تھے۔ میرے دو ذی علم استاد شاعری کے متعلق یہی نظریہ رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک مولوی سید جواد صاحب اخباری قبلہ مرحوم حسین آباد ہائی اسکول میں معلم دینیات تھے۔ ایک دن شعر و شاعری کی باتیں ہو رہی تھیں کہ غالبؔ کا ذکر نکل آیا۔ انھوں نے غالب کا یہ شعر؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا،
وہ اِک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

ایسے لہجے میں پڑھا اور پڑھ کر ایسا مُنہ بنایا جس سے انتہائی ناپسندیدگی اور تحقیر نکلتی تھی۔ اس کے بعد بڑے پیار کے لہجے میں فرمایا دیکھو ہمارا بھنگڑ سلطان کہتا ہے؎

سُرمہ لگا کے یار نے ترچھی نگاہ کی
موت آئی پھر کسی نہ کسی بے گناہ کی

آج کسی مقدس بزرگ کا کیا ذکر، کوئی عاشق مزاج نوجوان بھی آتش کے اس شعر کو غزل کا معیاری اور مثالی شعر قرار نہ دے گا۔

انھیں محترم بزرگ کے سامنے ایک موقع پر مَیں نے غالبؔ کی وہ غزل پڑھی جس کا مطلع ہے ؎

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

کیسے کیسے شعر اس غزل میں ہیں مگر ان کو کوئی شعر پسند نہ آیا۔ لیکن جب مَیں نے مقطع پڑھا

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

تو بڑے جوش کے ساتھ بول اُٹھے "ایسا کیوں نہیں کہتا، یہ گدھے کیوں کہتا ہے۔"

یہ پچاس پچپن برس پہلے کی بات ہے جب مَیں ہائی اسکول کا طالبِ علم تھا۔ اِس کے آٹھ نو برس بعد جب میں یونیورسٹی میں ملازم ہُوا تو ایک دن شعبۂ مشرقی کے فاضل اُستاد مولانا علی اصغر صاحب جو میرے اُستاد بھی رہ چکے تھے ان کے دریافت کرنے پر مَیں نے اُردو کے بڑے بڑے شاعروں کے نام لینا شروع کیے۔ میرؔ، انیسؔ، غالبؔ غالبؔ کا نام سُنتے ہی مولانا کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور بگڑ کر بولے "یہ میرؔ اور انیسؔ کے ساتھ غالبؔ کا کیا جوڑ۔ نہ اس کو اُردو پر عبور تھا نہ فارسی پر۔ ہزل کی جگہ جد اور جد کی جگہ ہزل ہے۔ ایک بے امتیاز شخص تھا۔" آج ان فاضل بزرگ کا ہم خیال چراغ لے کر ڈھونڈیے تو نہ ملے گا۔

مَیں نے ابھی جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہے کہ غالبؔ کو زندگی میں اور کلامِ غالبؔ کو ان کے بعد بھی بہت دنوں تک ایک مخالف ماحول سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اِسی مخالف ماحول میں ان کی شہرت نے اُبھرنا شروع کیا اور ایک زمانہ آیا کہ اسی لکھنؤ میں

اس عہد کے ممتاز شعرا نے ایک انجمن قائم کی جو میر و غالب کے رنگِ سخن کو اختیار کرنے کی غرض سے ماہوار مشاعرے کرتی تھی اور ان مشاعروں کی روداد اپنے ماہ نامے معیار میں شائع کرتی تھی۔ یہ انجمن میرؔ و غالبؔ تو پیدا نہیں کر سکی، لیکن لکھنؤ کے رنگِ تغزل کی اصلاح میں بہت معین ثابت ہوئی۔ غالبؔ کی شہرت کا حلقہ وسیع ہوتا گیا، یہاں تک کہ اب ساری دُنیا غالبؔ کے نام سے گونج رہی ہے۔

اس موقع پر میرے مرحوم دوست مرزا یگانہؔ چنگیزی کی تصویر میری نظروں میں پھر رہی ہے۔ مرحوم نے اپنی ایک کتاب میں غالبؔ پر سخت اعتراض کیے ہیں جو پہلے غالبؔ شکن کے نام سے اور پھر بہت سے اضافہ کے ساتھ غالبؔ شکن دوآتشہ کے نام سے شائع ہوئی۔ مصنف کے تیور کتاب کے نام سے ظاہر ہیں یہ کتاب اصل میں ایک طویل خط ہے جو مرزا یگانہؔ نے میرے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا۔ یگانہؔ مرحوم غالبؔ کی مخالفت کے لیے بہت بدنام ہوئے۔ لیکن وہ ذاتی طور پر خود کو غالبؔ کا مخالف نہیں غلطیوں کا مخالف کہتے تھے۔ ان کی مخالفانہ تحریروں کا مقصد خود ان کے قول کے مطابق یہ تھا کہ غالبؔ کے ان پرستاروں کو سبق دیا جائے جو غالبؔ کو صحیح طور پر سمجھے بغیر ان سے اندھی عقیدت رکھتے ہیں، ان کے کلام اور کردار کو ہر طرح کے عیوب سے مبرّا سمجھتے ہیں، اور ان کے سوا کسی دوسرے شاعر کے کمال کے قائل نہیں ہیں۔ کاش اس وقت مرزا یگانہؔ زندہ ہوتے اور غالبؔ کی صد سالہ یادگار کے سلسلے میں یہ عالمگیر دھوم دھام اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے۔

غالب کو یقین تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب اہلِ ذوق میرے کلام کے نشے سے مست ہوں گے اور میری شاعری کی شہرت دُنیا میں میرے بعد ہوگی۔

چنانچہ وہ کہتے ہیں:

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن   ایں مے از قحطِ خریداراں کہن خواہد شدن

گوہرم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است   شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

غالب کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور ان کے بعد ان کے کلام کی ایسی عالمگیر شہرت ہوئی جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔

اب میں یہ گفتگو اس معذرت کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ غالب کی صد سالہ یادگار کے موقع پر میں اپنے اُن احباب کی توقع پوری نہ کر سکا جو میرے قلم سے کسی معرکہ آرا مضمون کے متوقع تھے۔ جی تو میرا بھی چاہتا تھا کہ اپنی زبان کے اس مایۂ ناز شاعر کے شایانِ شان کچھ لکھوں لیکن اِس شاعر کا یہ شعر اب میرے حسبِ حال ہے۔

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی،
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اُس میں دم کیا ہے

ذکرِ غالبؔ

اُردو کے تمام مصنفوں اور شاعروں میں جو مقبولیت کچھ زمانے سے مرزا غالبؔ کو حاصل ہے وہ اور کسی کے حصّے میں نہیں آئی، پہلے کلام غالب کی شرح کی طرف توجہ کی گئی اور مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی نے شرح دیوان غالب لکھ کر اہلِ قلم کی جولانی طبع کے لیے ایک نیا میدان نکال دیا۔ اور غالبؔ کے اُردو دیوان کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ یہ بات اُردو کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ متعدد شرحوں کا کیا ذکر کسی دوسرے شاعر کے دیوان کی ایک شرح بھی آج تک نہیں لکھی گئی۔ شرحوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ غالب کے حالات زندگی کی تلاش و تدوین شروع ہوئی۔ خواجہ حالی نے یادگار غالب لکھ کر اس کام کی ابتدا کر دی تھی چونکہ یہ کام شرح نویسی سے زیادہ مشکل تھا اِس لیے ایک مدت تک اس میدان میں کسی اور نے قدم نہیں رکھا۔ صرف مولوی نظامی بدایونی نے غالب کی تحریروں کے اقتباسات سلیقے سے مرتب کر کے ان کی ایک مختصر سی خود نوشتہ سوانح عمری تیار کر دی۔ جو نکات غالبؔ کے نام سے شائع ہوئی۔ اِس چھوٹی سی کتاب سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ غالبؔ کے خطوں کو ادبی حیثیت سے جو اہمیت حاصل تھی اس کے علاوہ ایک دوسری طرح کی اہمیت بھی پیش نظر ہو گئی۔ یعنی لوگوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول ہو گئی کہ غالبؔ کے خطوط ان کے حالاتِ زندگی کے سب سے زیادہ معتبر اور سب سے زیادہ

کارآمد ماخذ ہیں، اب بعض لوگ غالبؔ کے خطوں کی تلاش و ترتیب میں منہمک ہو گئے اور بعض نے غالب کے خطوں اور دوسری تحریروں سے ان کے حالاتِ زندگی اخذ کرنا شروع کر دیا۔ پہلے گروہ میں مہیش پرشاد صاحب پروفیسر بنارس یونیورسٹی اور امتیاز علی صاحب عرشیؔ ناظم کتب خانہ ریاست رامپور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اور دوسری جماعت میں مولانا غلام رسول اور مسٹر محمد اکرام جن کی کتابیں غالب اور غالب نامہ علی الترتیب ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئیں۔ اِس سلسلے کی ایک اور کتاب ذکرِ غالبؔ کے نام سے اِسی سال شائع ہوئی ہے۔ اس کے مصنّف مالک رام صاحب ایم اے ہیں اور ناشر مکتبہ جامعہ، دہلی۔

یہ کتاب دیکھنے میں تو چھوٹی سی ہے مگر بقول دیباچہ نگار "اس تمام تحقیقات کا نچوڑ ہے جواب تک غالب کی سیرت کے متعلق ہو چکی ہے۔" مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مصنّف نے تلاش اور تحقیق کی زحمت بالکل نہیں اُٹھائی۔ انھوں نے دوسروں کی تحقیق سے فائدہ اُٹھایا ہے مگر کسی کی کورانہ تقلید نہیں کی ہے۔ جو بات لکھی ہے جانچ پڑتال کر لکھی ہے۔ اور اگر کوئی بات اپنی تحقیق میں درست ثابت نہیں ہوئی تو اس سے اختلاف کیا ہے مثلاً غزلیات وحشی کے دیباچہ نگار نے لکھا ہے کہ میرزا اکبر بیگ ولد میرزا جیون بیگ کے ساتھ غالب کی پھوپھی چھوٹی خانم صاحبہ کی شادی ہوئی تھی۔ مگر مالک رام صاحب نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ چھوٹی خانم صاحبہ مرزا غالب کی پھوپھی نہیں بلکہ حقیقی بڑی بہن تھیں۔ محمد اکرام صاحب نے میاں نظیر اکبر آبادی کو غالب کے اُستادوں میں شمار کیا ہے مگر مالک رام صاحب اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے، مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ خواجہ حاجی خاں مرزا غالبؔ کے خاندان کے بزرگ تھے مگر مالک رام صاحب نے ثابت کیا ہے کہ ایسا نہ تھا۔

مرزا غالب اور ان کے اعزا اور متعلقین کے بارے میں وہ تفصیلات و جزئیات اس چھوٹی سی کتاب میں موجود ہیں جن کی بڑی بڑی کتابوں میں بھی توقع نہیں کی جاسکتی، مصنف نے یہ تمام حالات غالب کی تحریروں، دوسروں کی تصنیفوں اور معتبر بزرگوں کے بیانوں سے اخذ کر کے نہایت خوش اسلوبی سے مرتب کیے ہیں۔

بعض لوگ جو غالب کی زندگی سے کافی واقفیت نہیں رکھتے وہ ان کی سیرت پر یہ سخت اعتراض کرتے ہیں، غالب سلطنت دہلی کے وظیفہ خوار تھے مگر ادھر خاندان مغلیہ کا اقتدار ختم ہوا ادھر وہ انگریزوں کے در پر جبیں سائی کرنے لگے۔ اور خلعت اور پنشن کے لیے دوا دوش کرتے پھرے۔ مگر اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ الزام غلط ٹھہرتا ہے۔ غالب کے چچا میرزا نصراللہ بیگ جنھوں نے بچپن میں غالب کو پالا تھا انگریزوں کی طرف سے چار سو سواروں کے ایک رسالے کے افسر تھے اور ایک بہت بڑی جاگیر کے مالک جس کی بدولت وہ اور ان کے متعلقین نہایت خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی مالی آمدنی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے خاندان کی پرورش کے لیے سرکار انگریزی نے دس ہزار روپے سالانہ پنشن مقرر کی تھی، مگر ایک صاحب کی کوشش سے دس ہزار کے پانچ ہی ہزار رہ گئے۔ اس رقم میں سے بھی دو ہزار سالانہ ایک مستحق شخص کو دلا دیے۔ بقیہ تین ہزار کی تقسیم اس طرح مقرر ہوئی کہ غالب کے حصے میں صرف سات سو روپے سالانہ یعنی ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار آئے۔ غدر کے زمانے میں یہ قلیل پنشن بند رہی۔ غالب کی زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوئی تھی، وہ تنگدستی اور فاقہ مستی کے عادی نہ تھے۔ اور ان کو یقین تھا کہ اگر سرکار انگریزی کے اعلیٰ حکام کو صحیح صورت حال کی اطلاع ہو جائے گی تو ان کے خاندان کو پوری پنشن یعنی دس ہزار روپے سالانہ ملنے لگیں گے۔ اور خود ان کی آمدنی میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔ اس حالت میں اغلب

نے پنشن کے لیے جو کوشش اور دوڑ دھوپ کی وہ قابلِ اعتراض نہیں ٹھہرتی ۔ ایک بات اور بھی قابل لحاظ ہے۔ جب غالب نے اپنی پنشن کے اجرا اور اضافہ کی کوشش شروع کی تو ان کو جواب ملا کہ " ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے ، اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو" غالب پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ جب باغیوں نے بہادر شاہ کی بادشاہت کا اعلان کیا تو انھوں نے یہ سکہ کہہ کر دیا ۔

بزر زد سکۂ کشورستانی　　سراج الدین بہادر شاہ ثانی

زمانہ وہ تھا کہ جس شخص کے متعلق یہ شبہ بھی ہُوا کہ وہ باغیوں سے سازش یا ہمدردی رکھتا ہے وہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا ۔ ایسی حالت میں صرف پنشن کے اجرا ۔ ہی کے لیے نہیں بلکہ اپنی جان بچانے کی غرض سے بھی غالب کے لیے انگریزوں کو خوش کرنا ضروری تھا ۔ جان و مال ، عزت و آبرو کی حفاظت کوئی جُرم نہیں ۔

غرضیکہ اِس کتاب میں غالب کی زندگی اور ان کی تصنیفات اور تمام ضروری معلومات موجود ہیں ۔ کتاب کی ترتیب مصنف کے سلیقے کا ثبوت ہے ۔ اس سلیقے کی بدولت کتاب میں اس قدر اختصار پیدا ہو گیا ہے کہ گویا کوزے میں دریا بند کر دیا ہے ۔

قتیلؔ اور غالبؔ

مرزا غالب کی زندگی میں جہاں کچھ لوگ ایسے تھے جو اُن کی فارسی دانی اور کمال شاعری کے قائل تھے وہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو ان پر طرح طرح کے اعتراض کیا کرتے تھے۔ ان کی اُردو شاعری کو تو بعض لوگ بے معنی کہنے میں بھی تامل نہ کرتے تھے۔ اِن اعتراضوں کا جو اثر غالب کے دل پر ہوتا تھا اس کی جھلک ان کے بعض شعروں میں دکھائی دیتی ہے۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی خواہش ‎ ‎ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ ‎ ‎ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!
گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے ‎ ‎ خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

غالبؔ کے اِنتقال کے بعد ان کے کلام کی طرف زیادہ توجہ کی جانے لگی۔ اِس صورت حال کے تمام اسباب بیان کرنے کا تو موقع نہیں البتہ اتنا کہہ دوں کہ اس میں دو کتابوں نے بہت کام کیا۔ ایک مولانا حالؔی کی یادگار غالبؔ، دوسری مولانا نظم طباطبائی کی شرح دیوانِ غالب۔ پہلی کتاب نے غالبؔ کی شخصیت میں عظمت اور دلکشی کے رنگ بھرے اور دوسری کتاب نے دیوان غالب کی شرحوں کا ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا سلسلہ قائم کر دیا۔ بہت سی شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور کتنی اب بھی لکھی جا رہی ہیں۔ اُردو شاعروں میں غالب کے سوا یہ بات کسی اور کے حصّے

میں نہیں آئی۔ اسی طرح غالب کے دیوان کے جتنے ایڈیشن شائع ہوتے اس کے چوتھائی بھی کسی دوسرے اُردو شاعر کے دیوان کے شائع نہیں ہوئے۔ غالب کو یہ شان نصیب ہوئی کہ ان کے دیوان کا چغتائی ایڈیشن ایک سو دس روپیہ فی نسخہ کے حساب سے خریدا گیا۔

غالب کے کلام پر بہت سے تنقیدی مضامین شائع ہوئے جن میں اُن کو اُردو کا سب سے بڑا یا کم سے کم بہت بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ لَے یہاں تک بڑھی کہ ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے اپنی کتاب محاسن کلام غالب میں مشرق و مغرب کے بڑے سے بڑے شاعروں کے مقابلے میں غالب ہی کو ترجیح دی۔ انھوں نے کتاب اِس جملے سے شروع کی ہے "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک مقدس وید دوسری دیوانِ غالب۔"

اِن تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ غالب کی عظمت عام طور پر دلوں میں بیٹھ گئی اور غالب کا کلام پڑھنا اور پسند کرنا تعلیم یافتہ طبقے کی وضع میں داخل ہوگیا۔ مگر اس کا ردِّعمل یہ بھی ہُوا کہ بعض لوگوں نے غالب کی زندگی اور کلام کا گہرا مطالعہ اِس نظر سے کرنا شروع کردیا کہ جو بلند درجہ ان کو دے دیا گیا ہے اس کے وہ حقیقت میں کس حد تک مستحق ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اِس کام میں سب سے پہلے جس شخص نے ہاتھ ڈالا وہ اِس عہد کے مشہور شاعر حضرت یگانہ لکھنوی ہیں۔ انھوں نے غالب کی زندگی اور کلام پر سخت تنقیدیں لکھیں اور اپنی اِس جسارت کے صلے میں بہت کچھ بُرا بھلا سُنا۔ ان کے بعد ڈاکٹر عبداللطیف صاحب حیدرآبادی نے اپنی کتاب غالب شائع کی۔ جس میں اصولی طریقے پر بحث کر کے غالب کی شاعری کا مرتبہ بہت پست قرار دیا۔ اس وقت مَیں جس کتاب پر مختصر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں یعنی قتیل اور غالب وہ بھی اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے مصنف سید انور علی صاحب فریدآبادی قتیل مرحوم کے ہم وطن ہیں۔

اِس کتاب میں اصل بحث تو یہ ہے کہ غالب نے اپنی تحریروں میں قتیل کی جو تحقیر کی ہے اور ان کے ذکر میں جو سخت کلمے استعمال کیے ہیں ان میں وہ حق بجانب نہ تھے اور فارسی دانی کے متعلق جو دعوے کیے ہیں وہ حقیقت سے دُور ہیں۔ اِس بحث کے ضمن میں مصنف نے بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں جن سے غالب کی اخلاقی حالت بہت پست نظر آنے لگتی ہے۔ مصنف کے بیانات زیادہ تر صحیح ہیں اور جو نتیجے انھوں نے نکالے ہیں وہ بھی غلط نہیں ہیں۔ مگر مجموعی حیثیت سے یہ غالب کی اِک رُخی تصویر ہے۔ صرف عیب ہی عیب نظر آتے ہیں۔ کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی۔ ایسی کتابیں ناواقفوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

حضرت مصنف ایک جگہ فرماتے ہیں:

"ہندوستانی فارسی دانوں کا اگر کچھ وقار قائم ہو سکتا ہے تو صرف اِس بنا پر کہ کلامِ فارسی میں ان کی نظر وسیع ہے۔ اور ہر ہر لفظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ اور اس حیثیت سے سچ پوچھیے تو غالب کے مقابلے میں قتیلؔ کا پایہ بہت بُلند ہے"۔

اِس بیان میں مصنف نے ایک ملائے مکتبی کو ادیب اور شاعر سے افضل مانا ہے مگر ان کی اس رائے سے شاید کم ہی لوگ اتفاق کریں گے۔ اِس بیان کے دوسرے حصّے میں مصنف نے ایک حیثیت سے قتیل کو غالب سے بہتر قرار دیا ہے۔ اگر ہم اس کو مان بھی لیں تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہے گی کہ فارسی ادب اور فارسی شاعری کی دُنیا میں غالبؔ کا مرتبہ قتیلؔ سے بہت بلند ہے۔ مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک ہندوستانی پروفیسر نے ایران کی سیاحت سے واپس آکر ان کو یہ اطلاع دی کہ "ایران میں غالبؔ یا ان کے دیوان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں"۔ مگر میرا ذاتی تجربہ اس کے خلاف ہے۔ مجھے طہران میں بعض نامور ایرانی ادیبوں سے ملنے کا اتفاق ہُوا

جو غالبؔ کو جانتے بھی تھے اور مانتے بھی تھے۔

مصنف نے غالبؔ کے بعض اُردو شعروں پر جو اعتراض کیے ہیں وہ زیادہ تر غلط ہیں۔ مثال کے طور پر دو شعر پیش کیے جاتے ہیں :-

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں ٭ کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

اس شعر کے متعلق مصنف کا ارشاد ہے۔

"مصرعہ اولیٰ میں حرف شرط کا کیا موقع ہے۔ یہ شعر کسی اور شعر سے ربط نہیں کھاتا مضمون ادھورا رہ گیا ہے"

مگر حقیقت میں یہاں حرف شرط بے موقع ہے نہ مضمون ادھورا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہجر میں ہم دیوار کو جو دیکھتے ہیں تو حقیقت میں صبا کو دیکھتے ہیں اور دروازے کو جو دیکھتے ہیں تو اصل میں نامہ بر کو دیکھتے ہیں۔ یعنی ہجر میں ہم کو ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ شاید صبا معشوق کا پیغام لاتی ہو یا نامہ بر اس کا خط لاتا ہو۔ اسی انتظار میں ہم کبھی دیوار کی طرف دیکھتے ہیں کبھی دروازے کی طرف۔ غالب کا دوسرا شعر یہ ہے :-

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے!

اس شعر پر مصنف کو یہ اعتراض ہے کہ "کبھی تو ہاں" کی الاپ محض تال پوری کرنے کے لیے نہیں تو اور کیا ہے"۔ اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ شعر صحیح طور سے پڑھا نہیں پہلے مصرع میں "کبھی تو ہاں" کے لفظوں کو ایک سا ادا نہیں کرنا چاہیے بلکہ "کبھی تو" کے بعد ذرا سا وقفہ ہونا چاہیے اور ہاں کو دوسرے مصرعے کے ساتھ ملا کر یوں پڑھنا چاہیے :-

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں ٭ شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

اِس شعر کو صحیح لہجہ سے پڑھنے کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کبھی تو ہاں بھرتی کے لفظ ہیں۔

اِن لغزشوں اور فروگزاشتوں کے باوجود ہم اِس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ فاضل مصنّف نے مواد کی تلاش اور ترتیب میں کافی محنت کی ہے۔ اور مطالب کو واضح اور دلنشیں انداز سے پیش کیا ہے۔

خطوطِ مشاہیر بنام ولایت و عزیز صفی پوری شاگرد غالب

(اس مقالے کا ماخذ سوانح اسلاف مصنفہ محمد عزیز اللہ عزیز معروف بہ منشی ولایت علی خاں ولایت ہے۔ یہ کتاب ۱۳۲۱ھ میں لکھی گئی اور بعض مضامین کے اضافے کے ساتھ ۱۳۴۶ھ میں ادبی پریس، لکھنؤ میں چھپی۔ "خواب و خیالِ دُنیا" اس کا تاریخی نام ہے۔ اس کتاب کا ایک حد درجہ خستہ و بوسیدہ نسخہ مفتی مولوی محمد رضا انصاری، فرنگی محلی کے پاس موجود ہے۔ (ادیب)

ادیبوں اور انشا پردازوں کا ایک خاندان شاہانِ اودھ کی قدر شناسیوں کی بدولت کئی پشتوں تک اعزاز و امتیاز کی مسند پر متمکن رہا۔ منشی فیض محمد فائق شاگرد مرزا فاخر مکین آصف الدولہ کے عہد میں ان کے وزیر حیدر بیگ خاں پیشدست تھے۔ ان کے بیٹے امیر الانشا رونق علی خاں رونقؔ سعادت علی خان کے عہد میں منشیوں میں ملازم ہوئے اور ترقی کر کے غازی الدین حیدر کے عہد میں بیت الانشا کے سر دفتر یعنی میر منشی ہو گئے اور اُمرا میں شمار ہونے لگے۔ ان کے چھوٹے بھائی منشی دانش علی نصیر الدین حیدر کے اتالیق تھے۔ منشی رونق علی خان کے بعد ان کے بیٹے منشی ثابت علی خان کو نصیر الدین حیدر نے امیر الانشا میر منشی ثابت علی خان بہادر کا خطاب دیا۔ محمد علی شاہ کے عہد میں بھی وہ معزز و ممتاز رہے۔ ان کے بعد محمد علی شاہ نے ان کے بیٹے منشی یحییٰ علی خان کو اخبار گشتی کا جو اخبار ڈیوڑھیات بھی کہلاتے تھے، داروغہ

مقرر کر کے خلعت سے سرفراز کیا۔ تین سو ہرکارے ان کے ماتحت تھے، جن میں سے دس بیس ان کی پالکی کے ساتھ یا ان کے مکان پر حاضر رہتے تھے، باقی بادشاہی مکانوں کی ڈیوڑھیوں اور شاہزادوں، نوابوں اور عہدہ داروں کے دروازوں پر حاضری دے کر شہر میں گشت کیا کرتے تھے اور قابلِ عرض واقعات داروغۂ اخبار (یعنی منشی یحییٰ علی) تک پہنچاتے تھے۔ داروغہ کے متصدی ان کو قلم بند کرتے اور وہ خود سے جاکر بادشاہ کے حضور میں پیش کرتے تھے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں ان کا یہی عہدہ رہا مگر کوئی خطاب نہ ملا۔ واجد علی شاہ نے ان کی ذاتی تنخواہ مقرر کی۔

منشی یحییٰ علی خان کے چھوٹے بھائی منشی محمد باقر علی خان بڑے زبردست انشاپرداز تھے۔ جب محمد علی شاہ نے حسین آباد تعمیر کیا، تو انھوں نے اس کی صفت میں ایک رسالہ "نزہت کدہ" لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں گزارنا۔ بادشاہ نے اس کو پسند کرکے اس کی پیشانی پر اپنے قلم سے یہ حکم لکھ دیا۔ "شرف الدولہ بہادر عہدہ تجویز نمایندہ" شرف الدولہ خود عربی و فارسی کے فاضل تھے۔ انھوں نے باقر علی خان کو کچہری وزارت میں بُلا کر اپنے سامنے بٹھا کر تین مضمون دیئے اور بادشاہوں کی طرف سے بادشاہوں کو نامے لکھوائے۔ ان ناموں کو دیکھ کر ان کو فکر ہوئی کہ یہ باپ دادا کی جگہ پائیں اور بیت الانشا کے سر دفتر مقرر کیے جائیں۔

عہد شاہی میں لکھنؤ میں مشاعروں کی طرح مناثرے بھی ہُوا کرتے تھے۔ ایک دن راجا لال جی کے یہاں مناثرہ ہوا۔ شعبان کا مہینہ تھا۔ نثاروں نے شب برات کی صفت میں نثریں لکھیں۔ مولوی احسان اللہ ممتاز اس زمانے میں بےعدیل نثار سمجھے جاتے تھے۔ وہ بھی دو نثریں لکھ کر لائے تھے۔ باقر علی خان نے تین نثریں پڑھیں جن کو سُننے کے بعد مولوی صاحب نے کہا: باقر علی اب ہم اپنی نثریں نہ پڑھیں گے۔ تمھاری نثروں کے آگے ان کو فروغ نہ ہوگا۔ ان کا یہ کہنا سُن کر کسی نے اپنی نثر نہ پڑھی اور

صحبت ختم ہوگئی۔ تدبیر الدولہ منشی مظفر علی اسیرؔ بھی اس صحبت میں شریک تھے۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ اگر یہ شخص زندہ رہا تو بہتوں کا چراغ گل کردے گا۔

باقر علی خان جب وہاں سے واپس آئے، تو اُن کو بخار تھا۔ پھر دِق کا مرض ہوگیا اور سال بھر کے بعد انتقال کیا؛ عہدہ پانے کی نوبت نہ آئی۔ انتقال کے وقت پورے تیس برس کے تھے۔

> "اِس خاندان کو اجازت بے پروائگی ہمیشہ سے رہی۔ یعنی جب بادشاہ محلات میں ہوں یا باہر، جس مکان میں بیٹھے ہوں، عرض معروض کی ضرورت نہ تھی، یہ لوگ بے روک ٹوک جا سکتے تھے۔" منشی یحییٰ علی کا "واجد علی شاہ کے عہد میں کوئی عہدہ نہ تھا، مگر تنخواہ خاندانی اور اجازت بے پروائگی بدستور تھی۔" (سوانح اسلاف : ۴۰)

منشی یحییٰ علی کے فرزندِ رشید ولایت علی بھی فارسی کے زبردست ادیب اور انشا پرداز تھے، مگر وہ ابھی کمال کی منزل کو نہ پہنچے تھے کہ اودھ کی شاہی کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کا قیام قصبہ صفی پور ضلع اُناؤ میں رہا۔ وہ شاہ خادم صفی محمدی کے مُرید اور سجادہ نشین ہوگئے۔ ان کا تخلص پہلے ولایت تھا، پھر عزیز ہوگیا۔ تخلص کی تبدیلی کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> "پہلی تصنیفات میں سب جگہ میرا تخلص ولایت ہے۔ ۱۲۸۶ھ میں حضرت مُرشدِ برحق نے مجھ کو فقیر کیا اور عزیز اللہ شاہ نام رکھا۔ جب سے مَیں نے تخلص بھی بدل ڈالا۔ اب عزیز تخلص ہے اور بعض مقام میں دونوں۔"
> (سوانح اسلاف : ۱۱۸)

یہ تمام حالات، جیسا کہ ابتدا میں بتایا جا چکا ہے، ولایت و عزیز کی کتاب

"سوانح اسلاف" سے لیے گئے ہیں۔ انھوں نے 'کتاب کا خلاصہ' کے عنوان سے ایک مسدس لکھا اس کے چند بند نقل کیے جاتے ہیں:

کس درجہ کارخانۂ دُنیا ہے بے ثبات　　دیکھا تو اِک طلسمِ تحیّر ہے کائنات
ہر صبح اور دن ہے تو ہر شام اور رات　　جو ایک حال پہ ہے وہ ہے بس خدا کی ذات
حیرت ہو آدمی کو، اگر کچھ بھی غور ہو
سمجھے خیال کر کے، تو حالت ہی اور ہو

مدّت سے لکھنؤ میں ہمارا مکان تھا　　ممتاز چند پُشت سے سب خاندان تھا
بازارِ خاص اور درِ دولت نشان تھا　　گویا کہ اس زمین پہ اور آسمان تھا
ہو کر تباہ آ کے صفی پور میں رہے
کہتے ہیں دل میں ہم بھی، کبھی لکھنؤ میں تھے

آبائے نیک نام دبیرانِ شاہ تھے　　سب راز دارِ خسروِ صاحب کُلاہ تھے
مشہور تھے، امیر تھے، باعزّ و جاہ تھے　　ہمدم تھے بادشاہ کے اور خیر خواہ تھے
اب ہم حقیر ہو کے نگاہوں سے گر گئے
چاروں طرف سے گردشِ گیتی میں گھر گئے

شاہِ اودھ کہاں ہیں، کہاں ہے وہ تاج و تخت　　وہ لکھنؤ کہاں ہے، کہاں ہیں وہ اہلِ بخت
یغما ہوئے خزانے، تو غارت ہوئے وہ رخت　　نازل ہوئی فلک سے اودھ پر بلائے سخت
ہم کیا ہیں، کیسے کیسے تباہی میں پڑ گئے
شاہ اور شاہ کے سب اعزا اُجڑ گئے

یا رب، وہ بادشہ کی سواری کدھر گئی　　وہ لکھنؤ سے بادِ بہاری[1] کدھر گئی!
ہے ہے، عزیز! عقل تمھاری کدھر گئی　　کہتے نہیں کہ عمر ہماری کدھر گئی

---

[1]: بادِ بہاری واجد علی شاہ نے اپنی سواری کا نام رکھا تھا۔

طفلی سے تم جوان ہوئے، پیر ہو گئے
گویا کہ انقلاب کی تصویر ہو گئے

ولایت (عزیز، غالب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے "غالب دہلوی سے اصلاح لینے
کا حال" یوں لکھا ہے:

"معاش کی سرگردانی میں سندیلے پہنچا۔ جیسا اوپر گزر چکا چودھری حشمت علی مرحوم کے یہاں مولوی لیاقت حسین، چودھری محمد عظیم، چودھری نصرت علی، چودھری رضا علی وغیرہ ہم کو پڑھاتے تھے۔ نثر و نظم کے سبب سے مجھ پر مہربان ہوئے اور اصلاح دی کہ دہلی میں اسد اللہ خاں غالب فارسی کے اُستاد ہیں ان سے رسم کتابت جاری کرنا چاہیے کہ اصلاح کلام قبول کریں مجھ کو تنگیِ معاش سے کچھ یاد نہ تھا۔ ان کے کہنے سے پُرانا حال یاد آیا۔ وہ یہ ہے کہ واجد علی شاہ کے عہد میں، جب میں نو دس برس کا تھا، سیّد احمد حسین میکش تخلص جوان خوبصورت غالب کے شاگرد لکھنؤ میں آئے تھے اور جناب والدِ ماجد مغفور اور عمِ مرحوم منشی احمد علی سے اور ان سے نہایت رابطہ تھا اور اکثر یہیں بیٹھے رہتے تھے اور غالب نے یہ قطعہ اپنے دیوان میں لکھا ہے:

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم، شانِ عجب و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ بیرم کہ میکش از ماست در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

اور عمِ مرحوم منشی احمد علی نے ان کی چار غزلیں ایک بیاض پر لکھ لی تھیں
ان میں سے ایک کا مطلع یہ ہے سہ

جاں لب کہ بجاں ز یارب آید ناچار بپرسش لب آید!

جب یہ سب باتیں یاد آئیں، ان کے کہنے سے غالب کو خط لکھا اور

انھوں نے قبول کیا اور لکھا کہ مسودہ کو گوروں نے مار ڈالا اور تاسف ظاہر کیا۔ پھر تین سال یا کچھ زیادہ میں اپنا کلام بھیجتا رہا۔ اس میں کی چند غزلیں 'دیوان ولایت' میں ہیں۔ الّا مَیں نے اب نظرِ ثانی سے سب کو اپنی مرضی کے موافق کر لیا ہے اور اصلاح والے اشعار بدستور ہیں اور 'پنج رقعہ' بھی بھیجا تھا۔ اس میں کہیں ایک حرف نہیں بنایا اور مکرّر لکھا کہ اس میں کہیں بنانے کی گنجائش بالکل نہیں اور انھیں دنوں میں یہ خبط ہوا کہ 'فسانۂ عجائب' کو تمام و کمال فارسی میں نظم کیا اور اس کو بھی بھیجا۔ غالب نے عذر لکھا کہ یہ کتاب بڑی ہے اور میری عمر باسٹھ برس کی ہے۔ آنکھیں کام نہیں دیتیں اور دل اور دماغ دونوں ضعیف ہیں۔ مَیں نے لکھا کہ اگر آپ نہ بنائیں گے تو مَیں چاک کر ڈالوں گا۔ پھر یہی کہا اور ان کو لکھا کہ آپ ہی چاک کر ڈالیے۔ مگر انھوں نے چاک نہیں کیا۔ اپنے ایک شاگرد کو دے دیا۔ پھر واللہ اعلم کیا انجام ہوا، اور جب انھوں نے عذر لکھا مَیں نے زیادہ تکلیف دینا مناسب نہ جانا اور غور و فکر سے گننے لگا اور سنہ بارہ سو اسی (۱۲۸۰ھ) کے بعد آپ ہی اپنے کلام کا معترض بن گیا پہلا دیوان فارسی بالکل چاک کر ڈالا۔ اس میں کی ایک غزل 'دیوان ولایت' میں ہے، وہ بھی پوری نہیں۔"

ولایت دعزیز کا زیادہ وقت شاعری اور نثر نگاری میں صرف ہوتا تھا۔ فارسی اور اُردو نثر و نظم میں چھوٹی بڑی، ۲۰ کتابیں ان کی تصنیف سے ہیں۔ اِن کتابوں کی طباعت اور اشاعت کے بارے میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"پہلے بھی میری چار کتابیں چھپ چکی تھیں مگر اس کے بعد عجیب سامان ہُوا کہ سید اشرف علی صاحب ڈپٹی کلکٹر جو رئیس صفی پور ہیں... اور

مجھ سے اوران سے کوئی راہ و رسم نہ تھی، ایک دن خود بخود میرے پاس آئے اور میرے کلام کو چھپوانے اور مشہور کرنے پر مستعد ہوئے، اور تمام ہندوستان میں کوئی مطبع اور کوئی انگریزی مدرسہ اور کوئی اخبار نہیں چھوڑا، اور نہ کوئی ریاست باقی رکھی کہ جس میں اپنا روپیہ خرچ کر کے میری کتابیں نہیں بھیجیں۔ اپنی ناموری کے ساتھ مجھ کو بھی مشہور کر دیا۔ اور اگرچہ ان کا مذہب اثنا عشری ہے مگر . . . ایسی کوشش میرے نامور کرنے کے لیے کی کہ میرے کسی ہم مذہب نے آج تک نہیں کی بلکہ عشرِ عشیر بھی نہیں کی اور نہ کرے گا . . . اللہ ان کو کامیاب رکھے اور ان کے ہر کام کا انجام بخیر کرے۔ (سوانح اسلاف : ۱۵۸)

حضرت ولایت و عزیز اپنے زمانے کے ارباب علم و ہنر کو اپنی تصنیفات کا ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے خود بیان کیا ہے، اس سلسلے میں جو خطوط ان کو موصول ہوتے تھے، وہ سوانح اسلاف میں شامل کر دیے ہیں۔ یہاں وہ بیان اور ان خطوں میں سے چند خط مع عنوانات درج کیے جاتے ہیں۔

اپنی تصنیفات کا ہدیہ بھیجنا اور اس وقت کے اربابِ علم و ہنر کا داد دینا

" واجد علی شاہ کے عہد تک دفتر زبان فارسی میں تھا۔ اس وجہ سے ہر شخص فارسی کا شائق تھا اور سب لوگ اپنی اولاد کو فارسی پڑھواتے تھے اور اگرچہ قابل اور لائق لوگ ہر وقت کم ہوتے ہیں، مگر عہدِ شاہی تک ہزاروں فارسی دان ملکِ اودھ میں تھے۔ اب فارسی ملکِ ہند سے مفقود ہو گئی۔ کہیں کہیں کوئی کوئی سُنا جاتا ہے۔ وہ بھی غور کرنے سے پورا نہیں سمجھا جاتا۔ بہر صورت مَیں نے جس جس کو اس وقت کے قابل

لوگوں میں قابل یا صاحبِ علم یا فارسی کا سمجھنے والا اُسنا اپنی نظم و نثر کی کتابیں بھیجیں۔ ان سب کے جوابات کو درج کرتا ہوں اور ان سب تحریروں میں فارسی گوئی کی نظر سے میرے استاد غالب دہلوی کی تحریر میرے نزدیک مسلم تر ہے اور تبحر اور علم کی نظر سے مولانا عبدالحق صاحب خیر آبادی کی نگارش اس سے زیادہ تر ہے اور کوئی سمجھے اور خود پسندی اور حسد کو دخل نہ دے، تو ان کا اتنا لکھنا کہ آپ کی انشا پردازی میں کچھ شک و شبہ نہیں اور میری تحریر کو گہر گراں بہا کہنا ایسا ہے کہ اگر سب قابلانِ ہند شاگردی کریں تو مقابل نہیں ہو سکتا۔

"اُستادی غالب دہلوی کا خط"

خاں صاحب عنایت مظہر سلامت۔ آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ اوراقِ پنج رقعہ نظر افروز ہوتے۔ خوشامد فقیر کا شیرہ نہیں۔ نگارش تمھاری پنج رقعہ سابق کی تحریر سے لفظاً و معناً بڑھ کر ہے۔ اس میں یہ معانیِ نازک اور الفاظِ آبدار کہاں! مگر ایک امر سے تمھیں آگاہ کرتا ہوں کہ یہ نثر ظہوری کی نہیں ہے، ارادت خان تخلص بہ واضح عالمگیری سرداروں میں سے ایک شخص تھا، مینا بازار اور پنج رقعہ اس کی فکر کا نتیجہ ہے تو ایسی کرت کی طرز ایجاد کی ہوئی اس کی ہے۔ موجد سے مقلد بہتر نکلا یعنی تم نے خوب لکھا و نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول۔

جہاں آپ نے فقیر کو مطلع لکھا ہے وہاں آپ بہ عرف میرے معرف ہوتے ہیں۔ متوقع ہوں کہ یا میرا شعر نکال ڈالو یا عرف کی جگہ تخلص لکھ دو۔

نجات کا طالب غالب

جناب مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی کا خط

جناب منشی صاحب مشفق مکرم سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام مسنون وشوقِ ملاقات ازحد افزوں واضح رائے عالی باد کہ آپ کا رسالہ اورارمغان مع خط کے پہنچا۔ آپ کی لیاقت اور انشاپردازی میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں مگر اس گہر گراں بہا کا حیدرآباد میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ وہاں تو انگریزیت کی قدر بجزیت کی منزلت ہے اور وہاں مجھ سے کسی امیر سے ایسا تعارف نہیں ہے کہ خط بھیجوں۔ آپ کے رسالے کے محامد ضرور لکھتا مگر کیا کروں مجبور ہوں، اور میرے لیے وہاں سے جو وظیفہ مقرر ہو گیا ہے تو اتفاقِ محض ہے، ورنہ مجھ سے کسی سے تعارف نہیں ہے۔

راقم محمد عبدالحق عفی عنہ

ناموَرِ آفاق ملا شبلی نعمانی کا کارڈ ارمغان اور نورہان کی رسید میں

حضور والا۔ پورے سال بھر سے بیمار ہوں۔ امید زیست منقطع ہو چکی تھی۔ تحریری وصیت نامہ ہو چکا تھا۔ اب ذرا افاقہ ہے۔ اچھا ہو لوں۔ تو آپ کے کلام کی داد دوں۔ اس بیماری میں بھی میں نے اس کو پڑھا اور اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ آج ہندوستان میں کوئی اس طرز کو نباہ نہیں سکتا۔

شبلی نعمانی اعظم گڑھ

سخنورِ نامی مولوی محمد محسن کاکوری کا کارڈ انھیں رسالوں کی رسید میں

آپ کے صحیفہ ۲؍ ربیع الاوّل کے ملاحظے سے حیرت ہوئی۔ میں نے تو اُسی دن جواب لکھا تھا اور میرا دستور ہے کہ خود میں جواب فوراً لکھتا ہوں یا کسی سے لکھا دیتا

ہوں ۔ اگر وہ پوسٹ کارڈ نہیں پہنچا تو اب اس کو رسید تصور فرمایئے اور آپ کی تعریف کس زبان سے فرمائی جائے ۔صنائع و بدائع اس خوبیِ عبارت کے ساتھ از قسم محالات ہیں ، اور مَیں کیا عرض کروں ، مجھ کو تو اب سخن اور سخن دانی سے تعلق ہی باقی نہیں رہا اور آپ کے مضامینِ عالی کا سمجھنا تو نہایت مشکل ہے ۔صلہ اس محنتِ شاقہ کا ریاست سے کچھ ہوا یا نہیں ۔

محمد محسن

مجتبیٰ مولوی ظہیر احسن شوق نیموی کا کارڈ

ذو اللطف و الکرم دام اخلاقکم ۔ بعد تحیتِ ماثورہ عرضِ خدمت سراپا محبت ہے ، رسالہ نورِ جان آپ کا بھیجا ہوا مع اخلاص نامہ نظر سے گزرا ۔ یاد آوری کا کمال شکرگزار ہوا ۔ رسالۂ مرسلہ کو جا بجا دیکھا ، سُبحان اللہ ! کس فصاحت اور پاکیزہ عبارت کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی ہے ۔ طبیعت دیکھ کر نہایت محظوظ ہوئی ۔ اللہ جل شانہٗ اس کو خلعتِ قبول عطا فرمائے ۔ والسلام خیر الختام ۔

شوق نیموی کان اللہ لہٗ

دُوسرا کارڈ

سخنورِ باکمال نثارِ بے مثال دام لطفکم ۔ بعد تحیتِ ماثورہ عرض ہے ، آپ کی دونوں کتابیں ذکر الحبیب اور ارمغان پہنچیں ۔ کمال ممنونِ عنایات ہوا ۔ جا بجا سے ان کے مطالعے کا اتفاق ہوا ۔ طبیعت نہایت محظوظ و مسرور ہوئی ۔ ماشاء اللہ یہ دونوں کتابیں بھی مثلِ کُتبِ سابقہ نہایت ہی مفید لاجواب ہیں ۔ اللہ جل شانہٗ خلعتِ قبول عطا فرمائے والسلام خیر الختام ۔

شوق نیموی کان اللہ لہٗ

تیسرا خط

نثارِ فصیح اللسان، ناظمِ بلیغ البیان، دام لطفکم۔ بعد تحیتِ ماثورہ عرضِ خدمت سراپا مودّت ہے، آپ کا تحفۂ جدیدہ پیش کشِ شاہجہانی پہنچا۔ ممنونِ عنایت فرمایا۔ اکثر مقامات سے سیر کی۔ سبحان اللہ آپ کی ذاتِ بابرکات بھی مغتنماتِ روزگار سے ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ اہلِ کمال کا کوئی قدر دان نہیں۔ خدا کرے کہ اس رسالے کی تالیف کی جو علّتِ غائی منقوشِ خاطر ہے، اس کا پردۂ غیب سے سامان ہو جائے۔ مَیں آپ کا کمال شکرگزار ہوں کہ مجھ کو قابلِ خطاب سمجھ کر اپنی جدید تالیفات سے یاد و شاد فرمایا کرتے ہیں۔ رسید میں اس وجہ سے تاخیر ہوئی کہ عید میں مکان چلا گیا تھا۔ جب واپس آیا، تو آپ کا ہدیہ نظر سے گزرا۔ والسلام خیر الختام

شوق نیموی کان اللہ لہٗ

مجتبیٰ مولوی الطاف حسین حالی

والا جناب۔ التسلیم اولیٰ بالتقدیم۔ مکرمت نامہ مع ارمغان و نورہان اور رسالۂ اشعار الاشعار کے شرف ورود لایا۔ نہایت افسوس ہے کہ بسبب مکروہاتِ چند درچند کے، ان تینوں کا شکریہ اور رسید بھیجنے میں بہت دیر ہو گئی۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ اگرچہ ارمغان و نورہان کو دیکھ کر اس لحاظ سے نہایت خوشی ہوئی کہ اس زمانۂ ناپرسان میں جب کہ کمالاتِ قدیم بسبب کساد بازاری کے صفحۂ روزگار سے مٹتے جاتے ہیں، آپ جیسے صاحبِ کمال خاکدانِ ہند میں اب تک موجود ہیں اور جس متاع کا ملک میں خریدار نہیں رہا، اس کے آپ ہی مالک ہیں اور آپ ہی خریدار ہیں۔ مگر فارسی زبان کی کس مپرسی حالت جو آج کل ہے اور آئندہ اس سے بھی زیادہ بیقدری؛

نظر آتی ہے، اس کا سخت افسوس ہے۔

مجلس چو برشکست تماشا بما رسید   در بزم چوں نماند کسے، جا بما رسید

ارمغان و نورہان کو بڑے شوق سے مَیں نے پڑھا اور چونکہ غالب مرحوم کے بعد یہ اندازِ بیان کسی کی نثر و نظم میں نہیں دیکھا تھا، اِن نثروں کو دیکھ کر بے اختیار زبان سے نکلا کہ "ھـذا الذی رزقنا من قبل"، مگر یہ تو ارشاد ہو کر اس جگر کا دی اور دماغ سوزی کا کچھ نتیجہ بھی ظاہر ہوا۔ مجھے جس قدر ذوق اور لطف ان دونوں رسالوں کے پڑھنے سے حاصل ہوا ہے، اس سے دس گنی زیادہ خوشی اس وقت حاصل ہو گی، جب یہ سنوں گا کہ حضورِ نظام خلد اللہ ملکہ اور مدار المہام سر وقار الامرا بہادر نے ان نثروں کی قدر اُن کے درجے اور مرتبے کے موافق فرمائی ہے۔ پس مَیں نہایت ممنون ہوں گا، اگر جناب اِن رسالوں کی سرگزشت سے، جو حیدرآباد میں پہنچ کر ان پر گزری، مطلع فرمائیں گے۔ زیادہ نیاز

خاکسار نیاز مند الطاف حسین حالی

دوسرا خط

جناب منشی صاحب مخدوم و مکرم دام فضلہم تسلیم۔ بنجِ گنجِ شاہجہانی کی تین جلدیں عطیۂ جناب خاکسار کے پاس پہنچیں، جن کو پڑھ کر آپ کے کمالِ انشا پردازی کا دل سے اقرار کیا۔ افسوس ہے کہ اس طبقے کے بعد جس میں کہ آپ اور مَیں ہوں کوئی ان کتابوں کا مطلب سمجھنے والا بھی نہ رہے گا چہ جائیکہ ان کی خوبی کا سمجھنے والا اور مصنف کی لیاقت اور کوشش کی داد دینے والا نظر آتے۔

مجلس چو برشکست تماشا بما رسید   در بزم چوں نماند کسے، جا بما رسید

معلوم نہیں کہ ارمغان و نورہان کے جلدو میں کوئی سلوک حیدرآباد کی طرف سے ظہور میں

آیا یا نہیں ۔ خدا کرے کہ حضور شاہجہان بیگم صاحبہ پیشکشِ شاہجہانی کی حسبِ دلخواہ قدر کریں اور آپ کی کوشش اور لیاقت کی کما ینبغی داد دیں ۔ میں آپ کی یاد آوری اور عنایت اور غائبانہ محبت کا صمیم قلب سے اور خلوصِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خدائے تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت کرے اور آپ کو فارغ البالی عنایت فرمائے۔ آپ ان لوگوں کی یادگار ہیں جن کی نشانیاں صفحۂ روزگار سے روز بروز مٹتی جاتی ہیں ۔ پس آپ کا وجود اس زمانے میں غنیمتِ کبریٰ ہے ۔ زیادہ نیاز

خاکسار نیازمند ۔ الطاف حسین حالیؔ

محبی خواجہ عزیز الدین عزیزؔ لکھنوی فارسی گو کا خط

مکرمی دام مجدکم !

زنسبتے کہ ترا با علی ولیِ خداست عیاں زاسمِ شریفت کمالِ صدق و صفات

محبتت بحقیقت بود محبتِ حق ولی شود ز ولایت کسے کہ زاہل صفاست

دو نسخۂ بلاغت بیان، فصاحت عنوان، یا دو دُرجِ لعلِ بدخشاں رسید و فقیرِ حقیر را قدر و بہا بخشید یا دو بُرجِ مطلعِ کواکب درخشاں تابید و ذرۂ ناچیز یعنی عزیزؔ را روشن سواد گردانید لذتے کہ ازآں یافتم، دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من ۔ سبحان اللہ، الحمد للہ، کہ ہنوز قلمروِ ہندستان خالی از اربابِ کمال و اصحابِ قال و حال نیست ۔ اگرچہ ایں (بے) برگ و نواہم خوشہ چینِ روضۂ ایں ریاض است امّا از چند سال مبتلائے خار خارِ امراض است، سرے کہ بایں سودا و نظرے کہ بایں تماشا داشت اکنوں ندارد ، در مجبوریِ دوامی می گزارد کہ چیزے نگارد ۔ ازآں جناب والا آرزو دارم کہ ہدا آں آستانِ فیض نشان گاہ گاہے بدعا یاد و شادم می فرمودہ باشند ۔ والسلام بالوف بالاحترام

عزیز الدین عزیزؔ عفا عنہ، از لکھنؤ چوک بستری خشی

جناب مرحوم منشی امیر احمد مینائی کا خط

(امیر مینائی کے چھ خط ہیں، ان میں سے تین مکاتیبِ امیر مینائی (مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب) میں شائع ہو چکے ہیں۔ باقی تین خط نقل کیے جاتے ہیں۔

(ادیب)

سعید و رشید ازلی، محبِ خفی و جلی، منشی ولایت علی صاحب سلمہٗ، اللہ الواہب سلامِ مسنون اخلاص و دعا مشحون۔ محبت نامہ سعادت شمامہ مورخہ ۱۲ رجمادی الاخرہ وقت پر پہنچ کر مسرت افزا و کاشفِ مافیہا ہوا تھا مگر ناچاقیِ طبیعت سے جواب میں تاخیر ہوئی۔ اس تحریر سے پہلے جس تحریر کا حوالہ آپ دیتے ہیں، اس کا پہنچنا مجھے یاد نہیں آتا۔ میلاد شریف مسمّٰی بہ خیابانِ آفرینش مع محامد خاتم النبیینؐ جن میں کچھ کلام نعتیہ بڑھا دیا ہے، ہدیہ بھیجتا ہوں۔ صنم خانۂ عشق دیوان دوم عاشقانہ کے نسخے نہیں ہیں، مگر وہ میرے مملوک نہیں، ورنہ وہ بھی اتحافاً روانہ کرتا۔ اس کی قیمت محصول کے علاوہ دو روپیہ ہے۔ بہت چاہتا ہے کہ آپ کے دیدارِ فرحت آثار سے آنکھیں پر نور ہوں اور دل مسرور۔ مگر خود سفر نہیں کر سکتا، آپ ہی اگر کبھی ہمت کریں، تو یہ آرزو بر آتے۔ نورِ چشم محمد احمد مع اخوان ماوجب گزار ہیں۔

امیر فقیر۔ رام پور۔ ۲۲ر نومبر ۱۸۹۷ء

دوسرا خط

سعید و رشید ازلی سلمکم اللہ۔ سلام مسنون، دعا مشحون۔ ارمغان کے تین نسخے پہنچ کر باعثِ منت پذیر ہوئے۔ جا بجا سے میں نے دیکھے اور آپ کی قابلیت پر آفرین کی سخن آفرینی و طبّاعی آپ نے اس کتاب میں صرف کی ہے، افسوس ہے

کہ اب کوئی آپ کا قدر شناس نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے مقاصد میں کامیاب فرمائے۔ کوئی تحریر آپ کی اس ہدیے کے ساتھ مجھے نہیں ملی۔ اس سے کیفیت وخیریت آپ کی معلوم ہوکر باعثِ سرورِ موفور ہوتی۔ مَیں آج کل امراض میں زیادہ مبتلا رہا اور گھر میں کئی عزیز مریض ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے۔ کبھی کبھی اپنی خیریت سے مطلع کیا کیجئے۔ سب عزیز واحباب ماوجب گذار ہیں۔

امیر فقیر۔ رامپور۔ ۱۲ر اپریل ۱۸۹۹ء

تیسرا خط

عزیز گرامی شان بہرچہ ستایم بالاتر ازآن سلمکم اللہ المنان۔

سلامِ مسنون اخلاص ودعا شون۔ رسالہ ذکر الحبیب آیا۔ ممنون ومسرور کیا۔ دو ایک جگہ سے بنظرِ سرسری مَیں نے دیکھا۔ ذوقی حالت ہر جگہ سے پیدا ہے۔ خداوند تعالیٰ آپ کے ذوقِ دوبالا کو بڑھائے اور مقاماتِ عالیہ تک پہنچائے۔ یہ بیمارِ تہی کاسہ ہے۔ آپ سے امیدوارِ دعائے حسنِ اختتام ہے کہ اب چراغِ سحری اور آفتابِ لبِ بام ہے۔ اس کی فروخت کے واسطے لوگوں سے کہا جائے گا۔ مگر یہ امید نہیں کہ اس میں کامیابی ہو۔ اہلِ مذاق سے یہ مقام خالی ہے۔ میلاد خوان بکثرت ہیں مگر خریداری کا حوصلہ کسی کو نہیں۔ مَیں نے بھی اس قسم کی جتنی بھی چیزیں لکھیں، یہاں وہ مفت ہی تقسیم ہوئیں۔ اشتہار شائع کر دیجئے۔ ملک سے رفتہ رفتہ درخواستیں آئیں گی۔ محمد احمد مع اخوان ماوجب گذار ہیں۔ اس نسخے میں غلط نامہ نہیں ہے۔ صحت کا اطمینان کیوں کر ہو۔

امیر فقیر۔ رامپور، ۲ر جنوری ۱۹۰۰ء



مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہُوں